ماہنامہ

انوارِ مدینہ

لاہور

بلغ العلیٰ بکمالہٖ

کشف الدجیٰ بجمالہٖ

حسنت جمیع خصالہٖ

صلوا علیہ وآلہٖ

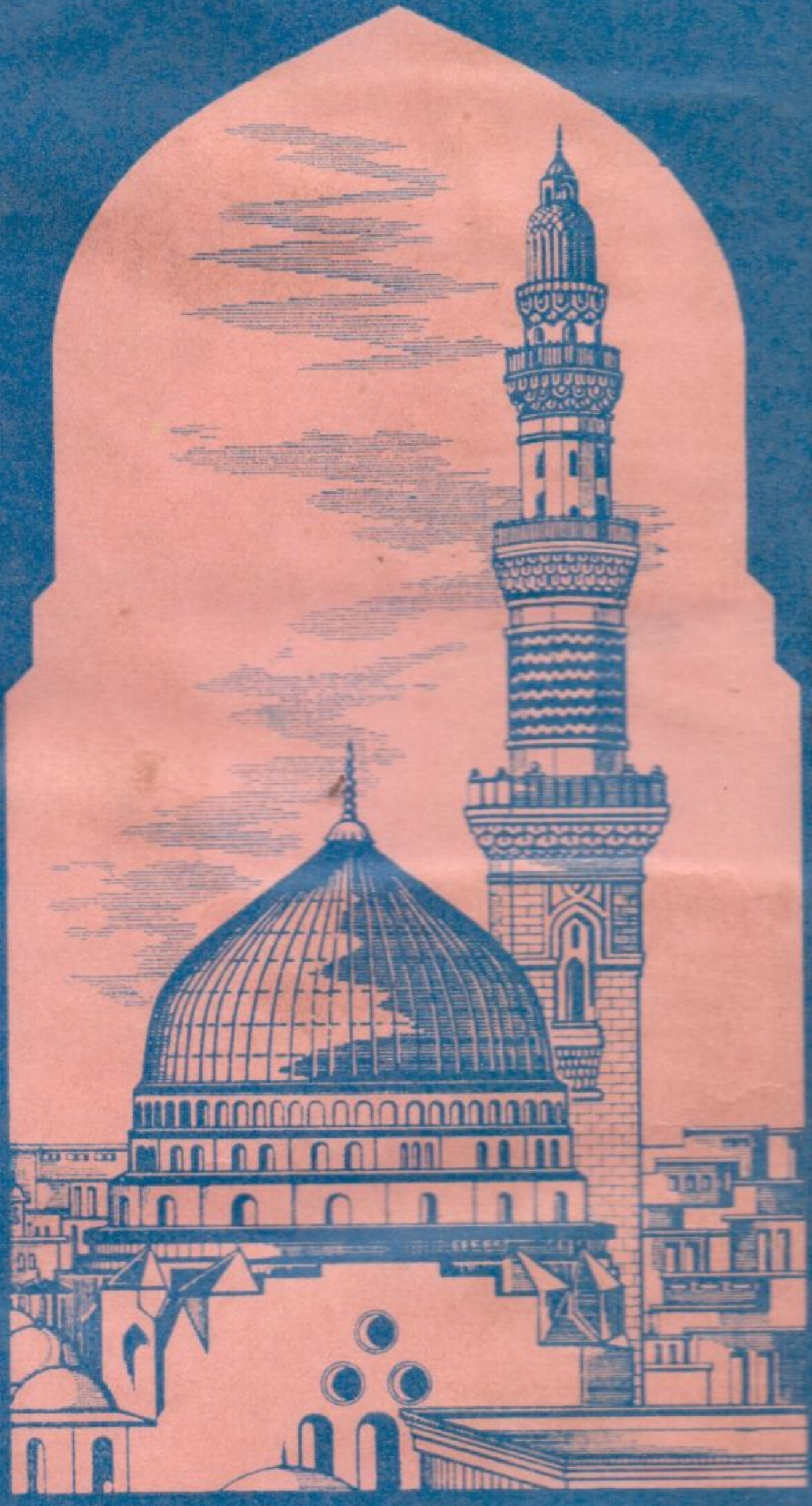

نقل

نگران اعلیٰ

حضرۃ مولانا سید حامد میاں مدظلہ مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدیر اعزازی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

ماہنامہ

انوارِ مدینہ

لاہور

مدیر معاون

حبیب الرحمٰن اشرف

جلد: ۳	جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ ○ جولائی ۱۹۷۲ء		شمارہ: ۱

فون

۶۲۹۳۲

بعض وجوہات کی بناء پر ہم جمادی الاخریٰ کا پرچہ شائع کرنے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا زیرِ نظر شمارہ دو ماہ کا سمجھا جائے ـــــ ادارہ

مرتب

حبیب الرحمٰن اشرف

بدل اشتراک: سالانہ سات روپے طلبہ کیلئے پانچ روپے فی پرچہ ۶۵ پیسے

جامعہ مدنیہ ○ کریم پارک ○ راوی روڈ ○ لاہور

اِس شمارے میں

اداریہ : ---------- ۳

ہماری ہر کوشش الخ ---------- حضرت مولانا مفتی محمود صاحب ---------- ۷

سیرۃ نبوی اور مستشرقین :---------- حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی ---------- ۱۱

اولٰئِک ہم الراشدون :---------- حضرت مولانا سیّد محمد میاں ---------- ۱۹

الشفاء الخ :---------- محترم نور محمّد غفاری ---------- ۲۹

حقیقتِ اسلامی کی آزمائش :---------- مولانا ابوالکلام آزادؒ ---------- ۳۶

منصبِ نبوت :---------- مولوی عبدالرشید لاہوری ---------- ۴۰

مولانا مناظر احسن گیلانی :---------- جناب اختر راہی ایم اے ---------- ۴۹

مولانا شیر زمان مدظلہٗ :---------- محترم فقیر محمّد ---------- ۵۶

اخبار الاولیاء :---------- حضرت سیّد نفیس ---------- ۵۸

صحت وصفائی :---------- محترم حکیم محمّد سعید دہلوی ---------- ۶۱

اور اعلانات و اطلاعات

سیّد حامد میاں مہتمم جامعہ مدنیہ طابع وناشر نے مکتبۂ جدید پریس لاہور سے چھپوا کر
دفتر ماہنامہ انوارِ مدینہ، جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقامِ مسرّت

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

بہت ہی خوشی کا مقام ہے کہ ۴ جون ۷۲ء کو حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہم وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد اور حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی مدظلہم جامعہ مدنیہ میں تشریف فرما ہوئے۔ اکرمہما اللہ وجزاھما خیراً۔

عصر بعد حضرت مولانا ہزاروی مدظلہم نے جماعت کی تنظیمِ نو کے بارے میں کچھ منٹ ارشاد فرمایا، پھر حضرت مفتی اعظم مدظلہم نے اپنے ارشادات سے مستفید فرمایا۔

آپ کی اگرچہ تمام ہی باتیں اہم تھیں (جو انشاء اللہ اسی رسالہ میں دی جائینگی)، لیکن ایک اہم بات جو صوبہ سرحد کے سیاسی اختلافات کی نوعیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ انہوں نے بہت واضح کلمات میں ارشاد فرمائی کہ ان چاروں صوبوں کی مثال چار بھائیوں کی سی ہے۔ بلکہ یہ مثال بھی ناکافی ہے ان کی مثال ایک جسم کی سی ہے کہ جسم سے اگر ہاتھ کو الگ کر دیا جائے تو ہاتھ مر جاتا ہے اور جسم پھر بھی قائم اور زندہ رہتا ہے۔ اگر ٹانگ کاٹ دی جائے تو وہ مر جاتی ہے۔ جسم پھر بھی زندہ رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح پاکستان کی مثال ہے کہ اگر کوئی صوبہ الگ ہونا چاہے تو وہ ٹانگ اور ہاتھ کی طرح کٹ کر مر جائے گا اور پاکستان پھر بھی قائم رہے گا۔ اس لیے "سرحد" کا باشندہ یہ نہیں سوچ سکتا کہ وہ پاکستان سے علیحدہ ہو جائے، کیونکہ اس علیحدگی کا مطلب یہ ہوگا کہ سرحد اپنی موت پر خود دستخط کر دے۔

حضرت مفتی صاحب نیپ اور جمعیۃ کے مشترکہ قائد اور صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ ہیں۔ ان کے یہ نظریات اور خیالات واضح کرتے ہیں کہ اہلِ سرحد مکمل طرح مطمئن ہیں، وہاں علیحدگی پسندی کا بحمداللہ کوئی رجحان نہیں۔ ہماری دعا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہماری مدد فرمائے اور اہالیانِ پاکستان کو اپنی اطاعت کی توفیق دے اور باہم اتحاد، اتفاق اور امن کے ساتھ مملکتِ پاکستان کو ناقابلِ تسخیر طاقت اور اسلام کا عظیم قلعہ بنا دے۔

ہم حضرت مولانا عبید اللہ انور مدظلہ ، جناب محترم عبدالحمید بٹ صاحب اور مقامی کارکنان جمعیۃ کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے موقع بخشا کہ حضرت مفتی صاحب مدظلہم جامعہ میں تشریف لائے اور ان کے خیالات سے سب مستفید ہوئے۔

وفات حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ

آپ حضرت مولانا بشیر احمد صاحب پسروری مدظلہم کی طرح حضرت مولانا احمد علی صاحب قدس سرہٗ کے اولین خلفاء میں سے تھے، زہد و تقویٰ، ذکر و فکر کے آثار چہرۂ انور ہی سے نمایاں تھے۔ آپ میں اس علم و تقویٰ کے ساتھ تواضع کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

تقریباً سات سال پیشتر آپکا گردہ کا آپریشن ہوا تھا، اسکی کمزوری چل ہی رہی تھی کہ شوگر کی شکایت کا اضافہ ہوگیا۔ اس کے باوجود تبلیغی سلسلہ میں دوبار انگلستان کا سفر فرمایا، گذشتہ سال سے پیشاب کے غدودوں کی تکلیف مستزاد ہوگئی اور آپریشن کی نوبت آئی۔ اسی میں تین دن بعد آپ نے وفات پائی۔ وفات کے وقت ظہر کی نماز ادا فرما رہے تھے اور چوتھی رکعت کے قعدہ میں تھے کہ جان جانِ آفریں کے سپرد ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ حضرت نے وفات سے پیشتر ایک خواب دیکھا تھا۔ گھر والوں سے فرمایا کرتے تھے کہ وہ ان کے پاس کچھ روز کے مہمان ہیں۔ خواب کی تعبیر یہ لی تھی وہ چالیس دن کے اندر دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا تعلقِ بیعت پہلے تو حضرت مولانا شبیر محمد صاحب شرقپوری قدس سرہٗ سے تھا۔ ان کے بعد آپکا تعلقِ بیعت حضرت شیخ التفسیر قدس سرہٗ سے قائم ہوا۔

حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ سے مجھے خاص تعلق تھا وہ بھی کرم فرماتے تھے۔ دو ایک بار میری فرمائش پر تشریف آوری بھی ہوئی اور مختصر قیام بھی۔ تغمدہ اللہ برحمتہ ورضوانہ

وفات حضرت مولانا عبدالجبار صاحب ابوہری رحمۃ اللہ علیہ

آپ فاضل دارالعلوم دیوبند اور حضرت اقدس مولانا مدنی قدس سرہٗ کے شاگرد تھے۔ گذشتہ سال حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب مدظلہم کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے جامعہ میں تشریف لائے تو میں زیارت سے بھی مشرف ہوا۔

حضرت مولاناؒ نے "چشتیاں" میں ایک بے نظیر مدرسہ قائم کیا۔ اس میں میں لڑکیوں کو مکمل درس نظامی کی تعلیم دی جاتی ہے اور بیرونی طالبات کی بحفاظت تمام رہائش کا انتظام ہے۔

آپ نے اب ملتان میں بھی تعلیمی ادارہ شروع کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آگیا اور آپ نے داعئ اجل کو لبیک کہا۔

بعض موتیں عجیب ہوتی ہیں۔ مولانا کی وفات بھی اسی طرح ایک عجیب انداز سے ہوئی کہ سبق کے دوران پڑھاتے پڑھاتے رُکے، دل پر ہاتھ رکھ کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور وفات پا گئے۔ اللّٰھم اغفرلنا ولہٗ ولاخواننا الذین ـــــ سبقونا بالایمان۔

ان ہر دو حضرات کے لیے دعاء مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حسن خاتمہ کی دولت سے نوازے۔

دُعاءِ استخارہ

لوگ بکثرت فرمائش کرتے ہیں کہ ان کے لیے فلاں کام کے بارے میں استخارہ کر دیا جائے، استخارہ کرنا سنت ہے اور احادیث میں اس کی مسنون دعاء آئی ہے جو ہر دیندار آدمی کو یاد کر لینی چاہیئے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے صلاح نہ لینا اور استخارہ نہ کرنا بدبختی اور کم نصیبی کی بات ہے۔

اس دعاء کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اپنے معاملہ کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے کہ اگر تیرے علم میں میرے لیے یہ کام بہتر ہو تو آسان فرمادے، ورنہ میری طبیعت کو اس سے ہٹا دے اور اس کام کو مجھ سے دور کر دے۔

اس دعاء کا طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت نفل پڑھ کر اسے ایک دفعہ یا تین دفعہ یا سات مرتبہ پڑھ لیا جائے اس کے بعد خود بخود کسی طرف طبیعت کا رجحان ہو جائے گا۔

مثلاً آپ جب اس دعاء سے فارغ ہوں اور وہ کام کرنا چاہیں تو آپ سے کوئی دوسرا ساتھی جس سے آپ اظہار خیال کر رہے ہوں۔ آپ کی تائید کر دے تو سمجھ جانا چاہیئے کہ یہ کام مفید ہے۔ یا اظہار خیال کرتے ہی کوئی اس خیال کی تردید میں بولنا شروع کر دے تو سمجھ جانا چاہیئے کہ یہ کام مضر ہے اس سے باز آجانا چاہیئے۔ غرض اس دعاء کے بعد خداوند کریم کی طرف سے ایسے اسباب سامنے آجاتے ہیں کہ جن سے کام آسان یا مشکل ہوتا چلا جائے گا۔

اس دعاء کے بعد کوئی خواب آنا ضروری نہیں، نہ ہی اس دعاء میں خواب کی طلب آئی ہے۔

اگر آپ کو زیادہ دن نہ مل سکے بلکہ اس کام کے بارے میں فوراً ہی فیصلہ کرنا ضروری ہے۔ مثلاً تجارتی لین دین کہ اس میں ایک ہی گھنٹہ کا موقع ملا تو یہ دعاء اس وقت بھی اسی قدر مفید ثابت ہوگی۔ دو رکعت

نفل پڑھ کر سات مرتبہ یہ دعاء پڑھ کر وہ کام کریں یا اسمیں آسانی پیدا ہو جائے گی، مثلاً پہلے ٹیلیفون خراب تھا آپ اس کام کے لیے آدمی بھیجنے کی تیاری کر رہے تھے، اس دعاء کے بعد دیکھا تو ٹیلیفون بھی ٹھیک ہو گیا اور بات بھی طے ہو گئی تو سمجھیں کہ یہ کام ٹھیک ہوا ورنہ اس کے برعکس رکاوٹیں سامنے آجائیں گی۔

دعاء یہ ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُکَ بِعِلْمِکَ وَ اَسْتَقْدِرُکَ بِقُدْرَتِکَ وَاَسْئَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ الْعَظِیْمِ فَاِنَّکَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ اَللّٰھُمَّ اِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَۃِ اَمْرِیْ فَاقْدُرْہُ لِیْ وَیَسِّرْہُ لِیْ ثُمَّ بَارِکْ لِیْ فِیْہِ وَاِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَۃِ اَمْرِیْ فَاصْرِفْہُ عَنِّیْ وَاصْرِفْنِیْ عَنْہُ وَاقْدُرْ لِیَ الْخَیْرَ حَیْثُ کَانَ ثُمَّ اَرْضِنِیْ بِہٖ۔

(ترجمہ) "اے اللہ! میں تجھ سے تیرے علم کے ذریعہ خیر طلب کرتا ہوں اور تیری قدرت چاہتا ہوں کہ مجھے قدرت حاصل ہو اور میں تجھ سے تیرا عظیم فضل مانگتا ہوں، کیونکہ تو قدرت رکھتا ہے اور میں نہیں رکھتا اور تو جانتا ہے اور میں نہیں جانتا اور تو غیب کی باتوں کو خوب جانتا ہے اے اللہ اگر تیرے علم میں یہ کام میرے لیے بہتر ہو، میرے دین، معاش اور انجام کے اعتبار سے تو اسے میرے لیے مقدر فرمادے (میرے بس میں کر دے) اسے میرے لیے آسان کر دے پھر اس میں میرے لیے برکت ڈالدے اور اگر تیرے علم میں یہ ہو کہ میرے لیے یہ کام بُرا ہے۔ میرے دین میں میرے معاش اور روزگار میں اور انجام کار میں۔ تو اس کام کو مجھ سے اور مجھے اس کام سے ہٹا دے اور میرے لیے جہاں کہیں بھی بھلائی ہو مقدر فرمادے پھر اس پر مجھے راضی کر دے"۔

جب ھٰذَا الْاَمْرَ پر پہنچیں (جس پر سطر کھینچی گئی ہے) تو اسکے پڑھتے وقت دلمیں اس کام کا دھیان کرلیں کہ جس کے لیے استخارہ کر رہے ہیں۔

جامعہ مدنیہ لاہور میں وزیر اعلیٰ صوبۂ سرحد
حضرۃ مولانا مفتی محمود کی تقریر!

ہماری ہر کوشش اسلامی نظام کے لیے ہے

پاکستان میں پہلی بار حقیقی جمہوری حکومت قائم ہوئی ہے

سرحد میں شراب کی طرح بھنگ اور چرس وغیرہ پر بھی پابندی ہے

پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ ایک ہی بدن کے اعضاء ہیں

عوام کی منتخب حکومتیں عوام کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتیں

○

"حضرۃ مولانا مفتی محمود مدظلہٗ العالی ۴ر جون ۱۹۷۲ء کو صوبۂ سرحد کی وزارت علیاء کا عہدہ سنبھالنے کے بعد پہلی مرتبہ "مجلس تحفظ ختم نبوّت" کے زیرِ اہتمام دہلی دروازہ میں بعد نمازِ عشاء منعقد ہونے والی "ختم نبوت کانفرنس" میں شمولیت فرمانے کے لیے لاہور آئے۔ آپ ہوائی اڈہ سے سیدھے جامعہ مدنیہ تشریف لائے۔ یہاں تھوڑی دیر آرام فرما کر نمازِ عصر ادا فرمائی اور پھر حسبِ اعلان جامعہ میں بھی (عصر و مغرب کے درمیان) ایک بڑے جلسہ سے خطاب فرمایا۔ آپ کے خطاب سے قبل مجاہد ملت حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی مدظلہ العالی اور حضرت مولانا محمد اجمل صاحب مدظلہ نے بھی تقریریں کیں۔

اس شمارہ میں حضرت مفتی صاحب مدظلہ کی تقریر کے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں"

◆

میں صوبۂ سرحد میں حکومت بنانے سے پہلے جس طرح آپ کا خادم تھا۔ آج بھی میں اسی طرح آپ کا خادم ہوں ـــــ میری حکومت، میری صوبۂ سرحد کی وزارت اور سیاسی جماعت صرف ہمارے

مقاصد کو جلد بروئے کار لانے کے لیے استعمال ہونگی ـــــ ہمارے مقاصد کیا ہیں اور ہم کیا چاہتے ہیں یہ سب پر واضح ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان میں وہ نظام قائم ہو، جس نظام کو قائم کرنے کے لیے پاکستان بنایا گیا تھا اور ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ایسا آئین نافذ ہو جس میں کتاب وسنت کے مطابق قانون بنانے کی مکمل ضمانت ہو۔ ہم اپنی تمام تر طاقت، افرادی طاقت، جوانوں کی طاقت، سیاسی طاقت سب کو اس کام پر لگائے ہوئے ہیں اور اس وقت تک ہماری یہ سعی جاری رہے گی، جب تک پاکستان میں مکمل اسلامی نظام جاری نہ ہو جائے۔

ہم حکومت میں اس لیے آئے ہیں اور وزارت کا عہدہ اس لیے قبول کیا ہے کہ شاید اس طرح سے ہمارے مقاصد کی جلد تکمیل ہو۔ جب تک حکومت اور وزارت ہمارے مقاصد کی تکمیل میں ہمارا ساتھ دے گی ہم بھی اس کا ساتھ دیں گے اور جونہی وزارت وحکومت، مقاصد کی تکمیل مین ہمارا ساتھ چھوڑ دے گی، ہم بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔

میرے پاس بہت سے رقعے آئے ہیں اور ایک اخبار کا تراشا بھی۔ جن میں پشاور کی جماعتِ اسلامی کے امیر کے اس الزام کا ذکر ہے کہ صوبہ سرحد میں ایک دعوت میں صوبہ کے ایک سینیئر وزیر نے شراب پی اور دوسروں کو پیش کی۔ محترم دوستو! اگر ان میں اخلاقی جرأت ہے تو اس سینیئر وزیر کا نام کیوں نہیں لیا؟ مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ سچے مدعی ہیں تو اخبار میں کھلے بندوں اس وزیر کا نام لے۔ مَیں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر سرحد کے کسی وزیر نے کسی وقت یا کسی حالت میں شراب پی ہے تو وہ سرحد کا وزیر نہیں رہ سکتا۔ میرے محترم دوستو! اس قسم کے الزامات لگانا اور پھر ان کا پرچار کرنا، اس کا مقصد سواء اسکے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ شراب بندی کا قانون لوگوں کے سامنے بے اثر کرنا چاہتے ہیں اور شراب کھولنے کے لیے قانون لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بالفرض اگر ایسا ہوا تھا تو اخبارات میں بیانات دینے کے بجائے اور لوگوں کے دلوں میں اثر ڈالنے کے بجائے اسکو چاہیئے تھا کہ وہ میرے پاس آتا۔ میرے دروازے چوبیس گھنٹے لوگوں کیلیے کھلے ہیں، مجھے براہ راست مطلع کرتا اور اگر یہ معترض ایسی دعوت میں شریک ہوا تھا جہاں شراب پی گئی تو اگر اس میں جرأت ہوتی تو اس مجلس ہی میں یہ اعتراض کرتا کہ جب یہاں شراب پر پابندی ہے تو پھر کیوں پی جاتی ہے۔ جس میں اتنی بھی جرأت نہیں ہے۔ اس کا بیان کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟ ـ میرے دوستو! جہاں تک قانون کا تعلق ہے۔ بلاشبہ حکومتِ سرحد نے قانون بنا دیا ہے اور میں آپکو بتانا چاہتا

ہوں کہ کافی مشکلات کے باوجود اور ہزاروں رکاوٹوں کے باوجود ہم نے شراب کے ذخیرے پکڑے۔ رکھنے پر پابندی، بیچنے پر پابندی، خریدنے پر پابندی لگائی۔ اگر کسی بھی حکم کی خلاف ورزی ہوئی ہے تو اس کا معاشرہ پر مدار ہوا کرتا ہے۔ مثلاً آپ جانتے ہیں کہ قانون میں چوری جرم ہے، قتل جرم ہے، ڈاکہ جرم ہے، مگر جرم ہونے کے باوجود، قانونی رکاوٹوں کے باوجود ہمارے ہی مسلمان بھائی قتل کرتے ہیں یا نہیں؟ ڈاکہ ڈالتے ہیں یا نہیں اور پھر چور دروازوں سے قانون کی زد سے بھی بچ جاتے ہیں۔ تو ایسا تمام دنیا میں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں قانون پر اعتراض کرنے سے اس قانون کو غیر مؤثر ثابت کرنا ہوتا ہے اور یہ قدم اچھا نہیں ہے۔

میرے محترم دوستو! مجھے یقین ہے کہ ہم نے جو قدم اٹھایا ہے پورے ملک اور تمام طبقوں نے اسکا استقبال کیا ہے اور اسے سراہا ہے۔ (امتناع شراب کا) قانون درست ہے۔ قانون پر کوئی اعتراض نہیں ہم مطمئن ہیں۔ شراب بند کر کے ہم یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ بس اسلامی نظام قائم کر لیا ہے اس کے لیے ہماری کوشش جاری ہی رہے گی۔ اور جہاں تک ہمارے اختیارات ہیں ہم انہیں مکمل طور پر اسلامی نظام لانے کے لیے استعمال کریں گے۔

میرے محترم دوستو! ہم خوش ہیں کہ آج ۲۵ سال کے بعد پاکستان میں مرکز اور صوبوں میں ایسی حکومتیں قائم ہیں جو عوام کی منتخب حکومتیں ہیں، گذشتہ ۲۵ سال کے دوران آمرانہ نظام رہا۔ جس میں سے تقریباً ۱۴ سال تو فوجی حکومت رہی۔ اب قوم نے خود اپنے نمائندوں کو منتخب کیا ہے۔ ۲۵ سال میں پہلی مرتبہ یہاں پر عوامی نمائندوں کو حکومت کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے حکومتیں چور دروازوں سے آیا کرتی تھیں، مگر اب آپ لوگوں نے اسکو منتخب کیا ہے، ہم چور دروازوں سے منتخب نہیں ہوتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حکومتیں جو عوام نے منتخب کی ہیں عوام کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتیں۔ عوام کے جذبات کا احترام ان حکومتوں کے لیے لازم ہے۔ جو قوم اپنے منتخب نمائندوں کو کرسیوں پر بٹھا سکتی ہے، وہ ان کو اتار بھی سکتی ہے۔ یہ وہ وقت نہیں کہ آپ کے جذبات سے کھیلا جائے اور آپ کا احترام نہ کیا جائے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ جب آپ چاہتے ہیں تو یہاں اسلامی نظام ضرور نافذ ہوگا، لیکن اگر یہاں شرعی قانون کا نفاذ نہ ہوا تو میں کہوں گا کہ آپ ہی یہ نہیں چاہتے۔

میں نے آپ سے کہا تھا کہ شراب حرام ہے۔ اس کا پینا شرعاً جرم ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے جرائم

موجود ہیں ایسے جرائم کا حکومت کو قلع قمع کرنا چاہیئے۔ آپ کے ملک میں انگریز کا قانون قائم ہے۔ انگریز کا قانون ہمیں صرف آپس میں لڑانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ ہمیں اکٹھا کرنیکے وسائل کو بھلانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس قانون میں بے شمار خرابیاں ہیں، ہمارے ہاں جب کسی کا بیل چوری ہو جاتا ہے تو وہ جس کی چوری ہوتی ہے قانون کے پاس نہیں جاتا بلکہ دلال کے پیچھے دوڑ کر چور کی تلاش کرتا ہے اور دلال کو ۳۰۰ روپے دیکر ۶۰۰ روپے کا بیل واپس کرتا ہے۔ اس لیے وہ شخص قانون کے پاس نہیں جاتا، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ دلال کے ذریعے تین سو روپے خرچ کر کے چھ سو روپے کا بیل مل جائیگا، لیکن قانون کے پاس ایک ہزار روپے بھی خرچ ہونگے اور بیل بھی نہیں ملے گا۔ اس لیے آپ کو اس قانون کے بدلنے کے لیے محنت کرنا ہوگی اور اس کو بدلا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

میرے محترم دوستو! کہتے ہیں کہ سرحد میں افیون، چرس، بھنگ پر کیوں پابندی نہیں لگائی گئی ہے، تو میرے بھائیو! چرس، بھنگ وغیرہ صوبۂ سرحد میں مکمل طور پر بند ہیں، جہاں تک افیون کا تعلق ہے تو میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس کی کاشت اور زمینوں میں پیداوار ہوتی ہے اور یہ مرکزی حکومت کی بات ہے، صوبے کی نہیں، اس لیے آئین کی رو سے صوبائی حکومت افیون پر پابندی لگانے کی مجاز نہیں۔

یہاں ایک اور بات بھی کہدوں، وہ یہ کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم پاکستان سے علیحدگی چاہتے ہیں۔ کوئی صوبہ بھی ہو پنجاب، سندھ، بلوچستان یا سرحد کوئی ہو پاکستان سے علیحدہ ہونے کا سوال ہی نہیں۔ میں ان تمام صوبوں کو بھائی بھائی ہی نہیں کہتا، بلکہ انکو ایک بدن کے چار اعضاء کہتا ہوں اس لئے ہم سب نے اکٹھا رہنا ہے۔ جو عضو بھی کٹ جائیگا وہ تو کسی بھی صورت میں نہیں بچے گا، لیکن بدن پھر بھی چاہے ناکارہ سہی، قائم ضرور رہے گا۔ تو میں آپکو بتا دوں کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ سرحد کے لوگ پاکستان سے الگ ہونا چاہتے ہیں۔ میں صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے، ایوان میں ایک مجاریٹی پارٹی اور اکثریت کے لیڈر ہونے کی حیثیت سے انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستانی ہیں، پاکستان کے ساتھ رہیں گے۔ سرحد اس کا لازمی جزو ہے، میرے دوستو! جسم تو شاید نقائص کے باوجود زندہ رہ سکے، لیکن کٹا ہوا ہاتھ یا کوئی اور عضو، ہرگز زندہ نہیں رہ سکتا۔ چاہے یہ صوبہ سرحد ہو، سندھ ہو، بلوچستان ہو یا پنجاب۔ لہٰذا آپ سب بھائیوں سے میری استدعا ہے کہ آپ متفق و متحد رہیے!

سیرۃ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

اور

مستشرقین

قسط : ۳

شیخ التفسیر حضرت علامہ مولانا شمس الحق صاحب افغانی مدظلہ،

وحی پر اعتراض مستشرقین کا یہ کہنا کہ کیفیت، وحی، مرگی کی بیماری تھی قطعاً نامعقول ہے۔ بوجوہاتِ ذیل۔

۱۔ صرع یا مرگی کی بیماری میں مرض کے دورے کے وقت جو واردات ہوتی ہیں، مریض کو افاقہ کی حالت میں اس کا قطعاً علم نہیں ہوتا کہ اس پر کیا وارد ہوا اور کس طرح وارد ہوا۔ اس حقیقت پر قدیم اطباء اور جدید ڈاکٹرز متفق ہیں۔ جس کو محمد حسین ہیکل مصری نے "حیاۃ محمدؐ" میں نقل کیا ہے، لیکن وحی نبوی کی حالت اس کے خلاف تھی۔ وحی کے دوران کے تمام الفاظِ وحی زوالِ کیفیت وحی کے بعد آپ کو یاد رہتے تھے اور وحی کی پوری کیفیت آپ کے حافظے میں ہوتی تھی۔ لہٰذا مرگی کا تخیّل صرف الزام تراشی ہے۔

۲۔ دوم یہ کہ مرگی کے ساتھ زمین پر گر پڑنا، منہ سے جھاگ آنا، انگلیوں کا سکڑ جانا لازمی ہے، لیکن یہاں ان میں سے کوئی چیز نہیں۔

۳۔ سوم یہ کہ وحی کی حالت میں جو پیغام آپ کو دیا گیا۔ جس کا نام قرآن ہے اور جس کی لفظی و معنوی حیرت انگیز معجزانہ خوبیوں سے دنیا بھر کے حکماء اور عقلاء عاجز ہیں اور جس کی اصلاحی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ بہت کم عرصہ میں اس نے عرب اور ماوراے عرب کے ان انسانوں کو جن کی زندگی سیاہ اور پُر از معاصی تھی اور ناقابلِ اصلاح تھی ایسے درندہ صفت انسانوں کو حضرت نے ایسی پاکیزہ زندگی عطا کی کہ تاریخ انسانیت میں اس کی نظیر نہیں۔ وہ عبادتِ الٰہی، خشیۃ اللہ اور اخلاق میں بے مثال، حسنِ معاملات، جہاں بانی، جہاں داری اور عدل وانصاف میں یکتا بن گئے۔ کیا کسی مرگی والے کی بات میں بھی اس قسم کا اثر ممکن ہے؟

۴۔ چہارم یہ کہ نبوت کا زمانہ تیئیس سال سے زیادہ ہے۔ اگر اتنی طویل مدت تک کوئی موذی مرض کا شکار ہو تو ضرور اسکی صحت خراب اور تباہ ہو جاتی ہے، لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صحت کا یہ حال تھا کہ تریسٹھ سال کی عمر تک جسمانی اور دماغی قوت آپکی بے نظیر تھی اور سر اور ڈاڑھی مبارک میں بہ مشکل بیس بال سفید ہوئے ہونگے جو انتہائی عمدگی صحت کی دلیل ہے۔

۵۔ پنجم یہ کہ تیرہ سو سال بعد کے دشمنوں نے آپ کے متعلق یہ فرضی جھوٹ تراشا، لیکن جو دشمن آپکے زمانے میں موجود تھے اور آپ کی حالت کا دن رات مشاہدہ کرتے تھے۔ جن میں مشرکین یہود اور نصاریٰ شامل تھے۔ ان میں سے کسی ایک فرد نے بھی آپ کی ذات کی نسبت مرض مرگی کا الزام نہیں لگایا۔ حالانکہ ان دشمنوں کو اس الزام تراشی کی زیادہ ضرورت تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ باحیا اور کسی قدر انسانی شرافت اور راست گوئی کی اہمیت کے قائل تھے اور اہلِ استشراق اس سے محروم ہیں۔

جہاد پر مستشرقین کا اعتراض | مستشرقین چونکہ مسیحی استعماری قوتوں کے ہراول دستے ہیں۔ جو مشنریوں کی طرح اسلامی ملکوں میں سامراجیت کے لیے راہ صاف کرتے ہیں۔ اس راہ کی بڑی رکاوٹ ان کے نزدیک مسلمانوں کا جذبۂ جہاد ہے۔ لہٰذا انہوں نے سارا زورِ قلم جہاد پر صرف کیا اور جہاد کو اسلام کی جبری اشاعت کا ذریعہ ٹھہرایا اور اس کو فساد اور وحشیانہ عمل قرار دیا۔ حالانکہ یہ دونوں الزام مسلمانوں کی مذہبی مقدس کتاب قرآن حکیم کے خلاف ہیں کہ خود قرآن کا حکم ہے۔

لا اکراہ فی الدین۔ دین اسلام کے لیے جبر و اکراہ منع ہے اور اس صریح اور واضح حکم کی موجودگی میں قرآن اور صاحبِ قرآن پر دینی جبر کا الزام قطعاً غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید استعماری مستشرقین کے علاوہ گذشتہ دور میں یہ الزام یہود و نصاریٰ و مشرکین میں سے کسی نے بھی قرآن اور صاحبِ قرآن پر نہیں لگایا۔ اگر کسی مسلمان بادشاہ کا شاذ و نادر کوئی واقعہ ایسا گذرا ہو تو وہ قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ اور اس کے خلاف کوئی عمل سند نہیں۔ ابن جریر نے ابن عباس سے اس آیت کا سبب نزول یہ نقل کیا ہے کہ حصین نامی انصاری کے دو بیٹے نصرانی تھے اور باپ خود مسلمان تھا۔ باپ نے حضور علیہ السلام سے پوچھا کہ میں بیٹوں کو اسلام پر مجبور کر سکتا ہوں؟ جس پر یہ آیت اتری۔ جس میں اسلام پر مجبور کرنے کی ممانعت کی گئی۔ کیونکہ ایمان وہ معتبر ہے جو دل کے اختیار سے ہو اور اخلاص پر مبنی ہو جیسے لیبلوکم ایکم احسن عملا۔ وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین۔ پہلی آیت میں امتحان مقصود ہے کہ اللہ لوگوں پر یہ ظاہر کر دے کہ دل اور بدن کے عمل میں اپنے اختیار سے کون اچھا ہے اور دوسری

آیت میں ہے کہ عبادت وہ مطلوب ہے جس میں اخلاص ہو اور اخلاص دل سے قبول کرنے سے حاصل ہوتا ہے اس کے علاوہ کافر اسلامی جہاد میں فوجی خدمات کے عوض معمولی جزیہ ادا کرتے ہوئے اپنے دین پر رہ کر اسلامی مملکت کے تمام حقوقِ شہریت حاصل کر سکتا ہے جیسے حتیٰ یعطوا الجزیۃ عن ید وّ ھم صاغرون یعنی اس وقت جنگ ختم ہو گی، جب جزیہ دیکر تابعداری مملکتِ اسلامی اختیار کریں۔ تفسیر مظہری ج ۱ ص ۳۳۶ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی میں ہے کہ یہ آیت منعِ اکراہ اور قبول جزیہ اہل کتاب سے خاص نہیں، بلکہ مشرکین کو بھی شامل ہے۔ اگرچہ نزول کا سبب واقعہ اہل الکتاب ہے، فرماتے ہیں تخصیص المورد لا یقتضی تخصیص النص وھو عام (ترجمہ) سبب نزول و مورد کے خاص ہونے سے نص کی تخصیص نہیں ہو گی۔ بلکہ نص عام ہے۔ اسی طرح لااکراہ کی آیت منسوخ بھی نہیں۔ جیسے بعض کا خیال ہے کہ یہ اقتلوا المشرکین کافۃ سے منسوخ ہے۔ صاحب مظہری کہتے ہیں نسخ کے لیے تعارض ضروری ہے اور یہاں تعارض نہیں، کیونکہ قتال دین پر جبر کے لیے نہیں بلکہ رفع فساد کے لیے ہے۔

مقصدِ جہاد دین پر جبر نہیں رفع فساد ہے جہاد کا مقصد خود قرآن نے بیان کیا۔ الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض وفساد کبیر۔ (ترجمہ) اگر تم جہاد نہ کرو گے تو خدا کی زمین پر بڑے فتنے اور فساد برپا ہونگے۔ یعنی جہاد کا مقصد فتنے اور فساد کو مٹانا ہے۔ لہٰذا مستشرقین کا خود جہاد کو فساد کہنا کس قدر غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کفار کے جن افراد سے فتنے اور فساد کا قوی اندیشہ نہ ہو۔ عین جنگ میں بھی اسلام نے ان کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ مثلاً نابالغ بچے، عورتیں، مشائخ، یعنی بوڑھے اور رہبان یعنی عبادت گذار درویش، اندھے، لنگڑے (مظہری ج ۱۔ ص ۳۳۶) یہ تحقیقی جواب ہے کہ مذہب اسلام خود دین میں جبر کے خلاف ہے اور جہاد فساد نہیں، بلکہ فساد کش عمل ہے۔ جیسے ایک مملکت کے باغی افراد بھی قتل و خونریزی کرتے ہیں اور قانونِ عدل کی خلاف ورزی کرتے ہیں، لیکن قانون عدل کی محافظ فوج جو اِن باغیوں سے لڑتی ہے۔ اس کی شکل بھی قتل کی ہے، لیکن باغیوں کا قتل فساد اور وحشیانہ عمل ہے اور قانون عدل کی محافظ فوج کا قتل ایک مقدس فعل ہے، جو رفعِ فساد، اقامتِ عدل اور رفعِ ظلم کے لیے ہے۔

قرآن نے صاف صاف اعلان کیا کہ دین میں جبر نہیں اور سنت نبوی میں بھی یہ حکم دیا گیا ہے، جیسے ذکر ہوا۔ اس کے علاوہ قرآن نے مستشرقین کی غلط الزام تراشی کی تردید کے لیے بار بار اس کا اعلان کیا کہ شبہ نہ رہے۔ سورۂ کہف میں فرمایا۔ قل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔ کہہ دے کہ یہ حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے تو جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے۔ سورۂ یونس میں فرمایا

ولو شاء ربک لآمن من فی الارض کلھم جمیعاً افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین (ترجمہ) "اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ لوگوں کو زبردستی مومن بنادے تو زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے۔ اے پیغمبر! کیا تو لوگوں پر اس لیے زبردستی کریگا کہ وہ ایمان لے آئیں" سورۃ توبہ میں قرآن کا ارشاد ہے۔ وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ ذلک بانھم قوم لا یعلمون۔ اگر لڑائی میں کوئی مشرک تجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دے۔ یہاں تک کہ کلام اللہ سن لے۔ پھر اس کو وہاں اس جگہ پہنچا دے جہاں وہ بے خوف ہو۔ یہ اس لیے کہ یہ بے علم لوگ ہیں اس میں یہ نہیں فرمایا کہ "اسلام یا تلوار" تاکہ جو کلام الٰہی اس نے سنا ہے اس پر غور کر کے صحیح رائے قائم کرے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ قرآن کا منشا یہ ہے کہ ایمان کا محرک تلوار نہ ہو بلکہ پُرامن حالت میں غور و غوص ہو۔ ایسی بہت سی باتیں ہیں، لیکن منصف کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اسی ضروری اسلحہ بندی سے مستشرقین نے جبری تبلیغ کا پہلو نکالا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان واضح تصریحات کے باوجود مستشرقین کو یہ غلط فہمی کہاں سے پیدا ہوئی کہ انہوں نے یہ الزام لگایا کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلایا گیا ہے؟ اس کا جواب تو یہ ہے کہ اکثر مستشرقین نے قصداً و دیدہ دانستہ سیاسی مقصد براری کے لیے ایسا کیا اور کچھ نے صاف اقرار کیا کہ اسلام صرف تبلیغ سے پھیلا ہے نہ جبر سے اور جبر کا ایک واقعہ بھی خیر القرون میں نہیں مل سکتا۔ جیسے اس مقصد کے لیے مسٹر آرنلڈ نے "دی پریچنگ آف اسلام" کتاب لکھی ہے اور یہ دعویٰ اس نے پوری کتاب میں ثابت کیا کہ اسلام جہاں جہاں پھیلا ہے تبلیغ کے اثر سے پھیلا، لیکن ایک گروہ غلط فہمی کا شکار ہوا جس کے اسبابِ غلطی حسبِ ذیل امور ہیں۔

۱۔ دورِ اوّل میں عرب میں تبلیغی جماعتیں جہاں جاتی تھیں مسلح ہو کر جاتی تھیں۔ اس مسلح جانے سے ان خودغرض مستشرقین نے یہ سمجھا کہ یہ مسلح مبلغین تلوار کے زور سے تبلیغ اسلام کر رہے ہیں۔ حالانکہ ایسا قطعاً نہ تھا۔ بلکہ ایسے واقعات عرب کے ملک میں اسلیے پیش آتے کہ وہاں کوئی منظم حکومت نہ تھی۔ مختلف قبائل عرب نے اپنے اپنے سرداروں کی قیادت میں الگ الگ ریاستیں قائم کر رکھی تھیں۔ لوٹ کھسوٹ ان کا ذریعہ معاش تھا۔ راستے میں بھی ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا تھا۔ اس کے علاوہ مبلغین حضرات مختلف قبائل کے افراد ہوتے تھے۔ وہ جن قبائل سے گذرتے تھے۔ یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ مبلغین کے قبائل کے ساتھ ان کی عداوت ہو اور وہ ان سے انتقام لینے کا قصد کریں۔ ان سب کے علاوہ عرب کی عام عادت یہ تھی کہ حفاظت خود اختیاری کے لیے مسلح سفر کرتے تھے۔ لہٰذا اس اسلحہ بندی کو جبرِ دین سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اکثر اوقات مبلغین کی تعداد بہت کم ہوتی تھی اور جس قبیلے میں

مبلغین جاتے تھے ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی ۔ اگر مقصود اسلام پر جبر کرنا ہوتا تو اس کے لیے مبلغین کی یہ قلیل تعداد کیونکر کافی ہو سکتی تھی۔

۲۔ غلط فہمی کی دوسری بڑی وجہ میدانِ جنگ کا وہ پیغام امن ہے جس سے خونریزی ٹل جائے اور امن و مصلحت قائم ہو۔ حضور علیہ السلام سردارانِ فوج کو یہ حکم دیتے تھے کہ جب تم مشرکوں اور دشمنوں کے مقابل ہو تو ان کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دو۔ ان میں جو بات بھی وہ مان لیں تو انکے ساتھ لڑائی کرنے سے رُک جاؤ۔ اول اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ قبول کریں تو پھر رُک جاؤ اور ان سے خواہش کرو کہ مسلمانوں کے ملک میں آجائیں تو انکا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے۔ اگر وہ نہ مانیں تو انکی حالت بدو مسلمانوں کی سی ہوگی۔ قانون ان پر مسلمانوں کا جاری ہوگا، لیکن غنیمت اور فے میں ان کا حصہ نہ ہوگا۔ جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کریں۔ اگر اسلام قبول نہ کریں تو ان کو جزیہ دیکر ذمی بننے کو کہہ دیا جائے۔ اگر اس کو وہ مان لیں تو ان سے بھی رک جاؤ۔ اگر وہ اسکو نہ مانیں تو پھر خدا کی مدد مانگ کر لڑائی شروع کرو (مسلم کتاب الجہاد والسیر) اس سے اہل یورپ نے یہ سمجھا کہ میدان جنگ کے بغیر بھی مسلمان ہر غیر مسلم کو جبراً مسلمان کرتا تھا۔ خواہ ذمی ہو یا معاہد ہو یا تارکِ جنگ۔

۳۔ غلط فہمی اس حدیث کے عدم فہم سے واقع ہوئی جس میں ارشاد ہے۔ امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یقولوا لا الہ الا اللہ فاذا قالوھا عصموا منی دمائھم واموالھم (ترجمہ) میں مامور ہوں کہ لوگوں سے لڑوں اس وقت تک کہ توحید کا اعتراف کریں۔ جب یہ اعتراف کریں تو میری طرف سے ان کی جان و مال محفوظ ہووے۔ اس سے مستشرقین نے یہ غلط نظریہ جمایا کہ مسلمان تلوار ہاتھ میں لیکر گھماتا ہے اور کافر سے یہ کہتا ہے کہ اسلام لاؤ، ورنہ تمہارے لیے تلوار ہے۔ ہم آیات و احادیث سے اس کی تردید کر چکے ہیں۔ حدیث مذکور کا تعلق میدانِ جنگ سے ہے کہ جب عین دورانِ جنگ میں کوئی کافر لا الہ الا اللہ کہہ دے تو رک جاؤ اور اس سے مت لڑو۔ اگرچہ جان بچانے کے لیے کہے اور دل سے نہ کہے۔ اسامہؓ نے جب ایک شخص کے متعلق یہ عذر پیش کیا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ کیا تو نے اس کا دل چیرا تھا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر مستشرقین کا یہ متعصبانہ بلکہ مجنونانہ الزام درست ہوتا تو بدر کے قیدی جب گرفتار ہو کر آئے تو ان سے یہ کیوں نہ کہا گیا کہ اسلام یا تلوار اور قرآن نے یہ حکم کیوں نازل کیا۔

فاما منا بعد واما فداء ۔ یعنی قیدیوں پر احسان رکھ کر مفت چھوڑ دو یا فدیہ لیکر چھوڑو"۔

فتح مکہ میں جو تقریباً دس ہزار کفار قیدی پیش ہوئے تو یہ فرمایا گیا۔ لا تثریب علیکم الیوم "میں

تمہارے اعمال پر تم کو ملامت نہیں کرتا۔ بلکہ تم آزاد ہو۔" اور یہ کیوں نہ کہا گیا کہ اسلام یا تلوار۔ ثمامہ رئیس یمامہ جب قید ہو کر آیا تو اس کو کچھ نہ کہا گیا۔ اس نے خود غسل کیا اور اسلام لایا اور حضور علیہ السلام نے اسے یہ کیوں نہ فرمایا کہ "اسلام یا تلوار"۔ خداوند تعالیٰ کا یہ ارشاد وان جنحوا للسلم فاجنح لها (انفال) اگر کفار کا محارب فریق صلح کے لیے جھک جائے۔ تو تم بھی جھک جاؤ۔ اور یہ کیوں نہ فرمایا گیا کہ اسلام یا تلوار۔ لا ینهاکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروهم وتقسطوا الیهم ط ان الله یحب المقسطین۔ تم کو اللہ ان کفار کے متعلق جو تم سے دین کی وجہ سے نہیں لڑے اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا۔ اس سے نہیں روکتا کہ ان کفار سے تم احسان کرو اور ان کافروں سے منصفانہ سلوک کرو۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ان کافروں سے ایسا کیوں نہ کہا گیا کہ اسلام لاؤ ورنہ تلوار ہے۔ سورۂ نساء میں خدا کا حکم قرآنی ہے۔ فان اعتزلوکم ولم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل الله لکم علیهم سبیلا۔ اگر وہ کفار تم سے کنارہ کریں۔ پھر نہ لڑیں اور وہ تمہارے سامنے صلح کا پیغام ڈالیں تو اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی ہے۔ قرآن حکیم اس قسم کے مضامین سے پُر ہے۔ جس سے یورپ کے اس مجنونانہ و متعصبانہ غلط الزام کی تردید ہوتی ہے۔ عاقل کے لیے اس قدر کافی ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ یورپ والے اسلام کے ان احکام کو دیکھ کر اسلام کا احسان مانتے کہ اسلام کے رحیمانہ اور مہذبانہ قانون میں عین جنگ کے شعلوں کے دوران دشمنوں کو وہ رعایتیں دی ہیں، جن کی کسی مذہب اور خاص کر بائیبل میں نظیر نہیں ملتی۔ مثلاً دورانِ جنگ میں سول آبادی میں بوڑھے، عورتیں، تارک الدنیا اور درویش افراد پر ہاتھ اٹھانا اور اُن سے لڑنا منع ہے۔ عین جنگ میں صلح کی پیش کش اگر دشمن کر دے تو جنگ رک جائے گی۔ آتشیں آلات سے مارنا منع ہے۔ لا تعذبوا بعذاب النار آگ کے عذاب سے کسی کو عذاب نہ دو۔

۴۔ چہارم سبب، جہاد اسلامی کے حقیقی مفہوم کے سمجھنے میں مسیحی یورپ کی غلط فہمی ہے۔ جہاد عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی کسی مقصد کے لیے جد و جہد کرنے کے ہیں اور اسلام اور قرآن و سنت کی اصطلاح میں اس مالی و جانی و قولی جد و جہد کا نام ہے جو فی سبیل اللہ ہو۔ سبیل النفس یا سبیل القوم یا سبیل الوطن کی آمیزش سے پاک ہو، وہ جہاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت نے جہاد کو اکثر مواضع میں جو ذکر کیا ہے تو ذات خداوندی کی طرف نسبت کر کے ذکر کیا ہے۔ وجاهدوا فی الله حق جهاده "پوری کوشش کرو اللہ کی راہ میں جیسے اس کا تقاضا ہے"، ابوداؤد کی حدیث ہے وجاهدوا بانفسکم واموالکم والسنتکم خدا کی راہ میں اپنے نفسوں، مال

اور زبان سے کوشش کرو۔ اب یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ سبیل اللہ کیا چیز ہے۔ سبیل اللہ، اللہ تعالےٰ کے اس بین الاقوامی اور انسانی قانون عادلانہ کا نام ہے جو خالص انصاف پر مبنی ہے اور جس میں کسی قوم اور ملک اور خاص نسل اور رنگ والے لوگوں کی طرفداری نہیں اور ہر جانبداری سے پاک ہے اور سب عالم کے لیے یکساں مفید ہے۔ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین (الانبیاء) ہم نے آپ کو وہ قانون دیکر بھیجا جو کل عالم کے لیے رحمت ہے۔ الحمد للہ الذی نزل الفرقان علی عبدہٖ لیکون للعالمین نذیراً (قرآن) ساری تعریف ایک خدا کو ہے۔ جس نے قرآن اتارا اپنے خاص بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تاکہ تمام عالم کو ظلم کے نتائج سے ڈرائے۔ یہی انسانی عمومی مفاد مقصدِ جہاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد کا مقصد یہ بتلایا ہے وجعل کلمۃ الذین کفروا السفلی وکلمۃ اللہ ھی العلیاء جہاد کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے کافرانہ قانون کو پست کر دیا اور اور اللہ کا قانون عادلانہ بلندی کے لائق ہے۔ حضور علیہ السلام نے جہاد کرنے والے کی یہ تعریف کی ہے۔ من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیاء جو اس لیے لڑے کہ اللہ کا قانون وانصاف بلند وبالا رہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے عالمگیر قانون وانصاف جس میں اللہ، انسان اور حیوانات کے حقوق محفوظ ہوں، جب اس کی آزادی کے ساتھ اشاعت کی راہ میں ظالمانہ قوتیں حائل ہو جاتی ہیں اور اشاعت حق کی آزادی سلب کرتی ہیں، ان کو دُور کرنے کی صورت میں حق وباطل، عدل وظلم کا معرکہ کارزار بھی شروع ہو جاتا ہے اور قتال تک نوبت پہنچتی ہے۔ ایسی صورت میں کبھی اہلِ باطل حق کو کچلنے کے لیے حملہ کرتے ہیں اور عہدِ نبوی کے غزوات میں اکثر ایسا ہوا۔ بدر، احد، خندق اور حنین اس کی روشن مثالیں ہیں۔ کبھی اہلِ باطل حق کی تباہی کے لیے تیاری کرتے ہیں تو اہلِ حق کو قبل از وقت مدافعت کرنی پڑتی ہے چنانچہ غزوہ موتہ وتبوک میں ایسا ہوا اور کبھی راہ حق کی اشاعت کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنے والی طاقتوں کو راہ سے ہٹا دیا جاتا ہے تاکہ حق کو آزادی نصیب ہو۔ ایسی صورت میں ابتدائی سرکوبی زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ عہد نبوت کے سرایا میں اکثر ایسا بھی ہوا ہے۔ اس کو آپ ابتدائی اقدام سے موسوم کر سکتے ہیں، لیکن مقصد وہی ہے جو عرض کیا گیا۔ سورۃ انفال کے آخر میں ہے والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض وفساد کبیر (ترجمہ) سب کفار قومیں اللہ کے قانون عدل کے خلاف متحدہ محاذ کی صورت میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اگر تم حق وعدل الٰہی کے لیے جہاد نہ کرو گے تو ساری زمین الٰہی حقوق کی بربادی یعنی فتنہ کی صورت میں پُر ہو جائے گی اور عقیدہ وعمل کی شخصی آزادی ختم ہو جائے گی۔ انسانی حقوق ظلم کے ہاتھوں پامال

ہوں گے اور بڑا فساد برپا ہوگا" یہ فرق ہے دنیوی جنگوں میں اور جہاد میں، دنیوی جنگ تخریبی عمل ہے۔ جیسے ڈاکو کسی کا ہاتھ کاٹ دیتا ہے اور جہاد اصلاحی عمل ہے جیسے سرجن زہریلے پھوڑے کی وجہ سے مریض کا ہاتھ کاٹتا ہے کہ باقی بدن محفوظ ہو جائے۔ افسوس کہ مستشرقین نے مسیحی اقوام کے تباہ کن آلات جنگ اور ایٹمی آلات سے گذشتہ دو عظیم جنگوں میں اور موجودہ وقت میں ویٹ کانگ میں جو بم برسائے اور انسان حیوانات، نباتات اور عمارات تک کو تباہ کر دیا اور وہ بھی صرف شیطانی مقصد کے لیے کہ قومی مفادات یا برتری ثابت ہو اس پر اعتراض سے خاموش ہیں۔ اگر اعتراض ہے تو اسلام کے اصلاحی معمولی عمل پر جس میں انسانیت کا عظیم تر مقصود پنہاں ہے۔ اگر اسلام میں دینی جبریت ہوتی تو ہزار سال یا اس سے زیادہ عرصہ تک عراق، مصر، شام اور ہندوستان میں اسلام نے حکومت کی، لیکن چاروں ملکوں میں بدستور عیسائی، یہودی اور ہندو موجود رہے اور بڑے عہدوں پر فائز رہے اور ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ کوئی مسلمان تلوار لیکر اٹھا ہو اور اس نے کسی یہودی عیسائی یا ہندو سے کہا ہو کہ "اسلام یا تلوار"۔ برخلاف عیسائیوں کے کہ سپین اور سسلی میں مسلمانوں کی آٹھ سو سال حکومت رہی، لیکن جب مسیحی اقتدار آیا تو انہوں نے مسلمانوں کا نام و نشان بلکہ قبروں تک کو مٹا دیا۔ یہی حال موجودہ ہندوؤں کا ہے کہ انہوں نے چند برسوں میں بیس لاکھ مسلمان قتل کیے، ایک کروڑ کو جلا وطن کیا اور ہر روز ان کے فنا کرنے میں مصروف ہیں، لیکن پاکستان، افغانستان اور ایران میں کسی ہندو یا سکھ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ یہ اس دورِ انحطاط میں اسلامی تعلیم کا اثر ہے جو مشاہدہ کیا جا رہا ہے کہ دین کی وجہ سے کسی پر جبر نہیں کیا جاتا نہ کسی کی حق تلفی کی جاتی ہے۔

اب ہم بائیبل سے جبر و اکراہ اور مذہبی جنگوں کے متعلق مختصر حوالجات پیش کرتے ہیں۔ تاکہ معلوم ہو کہ جہاد اسلام سے مختص نہیں۔ بلکہ بائیبل کا جہاد اسلام کے جہاد سے سخت ہے۔ (۱) تورات کتاب استثناء باب ۲۰ میں حضرت موسیٰؑ کو خطاب ہے۔ کہ جب تم کسی شہر میں داخل ہو یا اس کے قریب ہو تو ان کو صلح کی طرف بلاؤ۔ اگر قبول کرے تو اس کے سب رہنے والے تمہارے غلام ہونگے۔ تم کو جزیہ دیں گے اور اگر صلح قبول نہ کرے تو تمام مردوں کو قتل کرو۔ اور عورتوں، بچوں، مویشیوں اور جو کچھ شہر میں ہے۔ خاص اپنے لیے مالِ غنیمت بناؤ۔ (۲) تورات کی کتاب عدد باب ۳۳ میں بنی اسرائیل کو خطاب ہے کہ جب تم اردن سے گذرو اور تم کنعان میں داخل ہو تو وہاں کے تمام باشندوں کو ہلاک کرو اور تباہ کرو انکی مسجدوں کو (۳) تورات کتاب

باقی ص ۳۸ پر

فتنوں کی سرکوبی

قسط : ۱۶

اُولٰئِکَ ھُمُ الرّاشِدُوْن

"خلافت وملوکیت" کے جواب میں!

شیخ الحدیث حضرۃ مولانا سید محمد میاں ادام اللہ معالیھم

مروان بن الحکم اور الحکم بن العاص
حیثیتیں اور رعایتیں

مودودی صاحب فرماتے ہیں :-

۱- مروان بن الحکم کی پوزیشن دیکھیے ، اس کا باپ حکم بن ابی العاص ، جو حضرت عثمان کا چچا تھا ، فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوا تھا اور مدینہ آکر رہ گیا تھا ، مگر اس کی بعض حرکات کی وجہ سے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے نکال دیا تھا اور طائف میں رہنے کا حکم دیا تھا ۔ ابن عبدالبر نے استیعاب میں اس کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اکابر صحابہ کے ساتھ راز میں جو مشورے فرماتے تھے ان کی کسی نہ کسی طرح یہ سن گن لے کر وہ انہیں افشاء کر دیتا تھا اور دوسری وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نقلیں اتارا کرتا تھا ۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ خود حضورؐ نے اسے یہ حرکت کرتے دیکھ لیا ۔ بہرحال کوئی سخت قصور ہی ایسا ہو سکتا ہے جس کی بناء پر حضورؐ نے مدینہ سے اس کے اخراج کا حکم صادر فرمایا تھا ۔ مروان اس وقت ۷ - ۸ برس کا تھا اور وہ بھی اس کے ساتھ طائف میں رہا ۔ جب حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو ان سے عرض کیا گیا کہ اسے واپسی کی اجازت دے دیں ، مگر انہوں نے انکار کر دیا ۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی اسے مدینہ آنے کی اجازت نہ دی گئی ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے خلافت کے زمانہ میں اس کو واپس بلا لیا اور ایک روایت کے مطابق آپ نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی سفارش کی تھی اور حضورؐ نے مجھ سے وعدہ فرما لیا تھا کہ اسے واپسی کی اجازت دیدیں گے ۔ اس طرح یہ دونوں باپ بیٹے طائف سے مدینہ آگئے ۔

اگر مروان کے اس پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس کا سیکرٹری کے

منصب پر مقرر کیا جانا لوگوں کو کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔ لوگ حضرت عثمان کے اعتماد پر تو یہ مان سکتے تھے کہ حضورؐ نے ان کی سفارش قبول کر کے حکم کو واپسی کی اجازت دینے کا وعدہ فرمالیا تھا۔ اس لیے اسے واپس بلا لینا قابلِ اعتراض نہیں ہے، لیکن یہ مان لینا لوگوں کے لیے سخت مشکل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی معتوب شخص کا بیٹا اس بات کا بھی اہل ہے کہ تمام اکابر صحابہ کو چھوڑ کر اسے خلیفہ کا سکریٹری بنا دیا جائے۔ خصوصاً جبکہ اس کا معتوب باپ زندہ موجود تھا اور اپنے بیٹے کے ذریعہ حکومت کے کاموں پر اثر انداز ہو سکتا تھا (خلافت و ملوکیت ص ۱۱۱)

کسی تاویل سے بھی اس بات کو صحیح نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ ریاست کا سربراہ اپنے ہی خاندان کے ایک فرد کو حکومت کا چیف سکریٹری بنا دے۔ (ص ۳۲۲)

تبصرہ ——— جب آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی جائے تو ہم نہیں سمجھتے کہ اس کے لیے کیا لفظ استعمال کریں۔ سکریٹری اور چیف سکریٹری کا لفظ استعمال فرمایا گیا تاکہ ذہن ایک ہیبت ناک عہدہ کی طرف متوجہ ہو۔ پھر مروان کو اس عہدہ کی کرسی پر بٹھا کر خلیفۂ سوم پر ایک الزام چسپاں کر دیا گیا (معاذ اللہ) حالانکہ پہلا فرض یہ ہے کہ مودودی صاحب ثابت کریں کہ خلافتِ راشدہ کے نظام میں سکریٹری یا چیف سکریٹری کا کوئی عہدہ ہوتا تھا، پھر یہ ثابت کریں کہ اس کے اختیارات اتنے وسیع ہوتے تھے کہ اتنی بڑی حکومت کو متاثر کر سکیں جو افغانستان اور ترکستان سے لے کر شمالی افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ (خلافت و ملوکیت ص ۳۲۳) تب یہ اعتراض باوزن ہو سکتا تھا کہ اتنے بڑے عہدے پر اپنے ہی خاندان کے ایک فرد کو مسلط کر دیا اور اگر مروان کی حیثیت صرف ایک خادم کی ثابت ہو تو ظاہر ہے یہ الفاظ افتراء سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

مروان کے متعلق ابن سعد نے تحریر کیا ہے۔ "کان کاتبا لہ" مروان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کاتب تھا۔ یہی لفظ دوسرے مورخین نے استعمال کیا ہے۔ مودودی صاحب تو ماشاء اللہ گریجویٹ ہیں۔

آپ جیسا قابل تو درکنار، معمولی قابلیت کا خواندہ انسان بھی جانتا ہے کہ "کاتب" کا ترجمہ محرر یا منشی ہوتا ہے، یہ مودودی صاحب کی افتراء آمیز جدت ہے کہ کاتب کی تصویر سکریٹری یا چیف سکریٹری کے لفظ سے کھینچ رہے ہیں۔ بیشک خلفاءِ عباسیہ اور غالباً خلفاء بنی امیہ کے آخری دور میں کاتب نے ایک حیثیت حاصل کر لی تھی، مگر وہ اختیارات کے لحاظ سے نہیں تھی، بلکہ قابلیت کے لحاظ سے تھی۔

ہمارے زمانے میں اسٹینو گرافر کا کام یہ ہوتا ہے کہ "صاحب" جو کچھ بولیں وہ شارٹ ہینڈ سے نقش کر لیں۔ پھر اس کو صاف کر کے صاحب کے سامنے پیش کر دیں۔ وہ کوئی خط، حکم یا فیصلہ بن جاتا ہے۔ اس کو ادبیت سے کوئی

تعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ ہمارے زمانہ میں عموماً سرکاری تحریریں ادبیت سے ناآشنا ہوتی ہیں، لیکن خلفاء اور سلاطین اسلام کے دور میں کاتب کا کام صرف قلمبند کرنا نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا فرض یہ ہوتا تھا کہ اپنے افسر یا آقا کے منشاء اور مفہوم کو نہایت موزوں اور مرصع الفاظ کا جامہ پہنائے۔ جس میں ظاہری یعنی ادبی خوبیوں کے ساتھ معنوی خوبیاں بھی ہوں اور وہ کلام الملوک ملوک الکلام کا آئینہ دار ہو۔ اسی لحاظ سے اس پیشہ نے خاص اہمیت حاصل کر لی تھی۔

کاتب ایک ایسا قابل و فاضل ہوتا تھا جو نظم و ادیبانہ نثر کی قابلیت کے ساتھ ماحول کے حالات اور نفسیات سے بھی واقف ہو۔ وہ مکتوب الیہ کے مذاق اور اس کے نفسیات کا بھی احساس رکھتا ہو۔ حال کی طرح کچھ ماضی کا علم بھی اس کے پاس ہو۔ یعنی تاریخ سے واقف ہو۔ دیگر ممالک سے خط و کتابت ہو تو وہاں کے حالات اور ان کے نفسیات سے بھی واقفیت ضروری ہوتی تھی۔ ابوالفضل کے لکھے ہوئے خطوط تو فارسی انشاء کے سرتاج مانے جاتے ہیں۔ ان کو پڑھایا بھی جاتا ہے۔ خلفاء عباسیہ اور بنی امیہ کے زمانہ کے کاتبوں کے بھی بہت سے خطوط عربی انشاء کی جان ہیں۔ "العقد الفرید"۔ "المستطرف" کشکول بہاؤالدین وغیرہ میں بہت سے خطوط ادبی شاہکاروں کی حیثیت سے نقل کیے گئے ہیں۔ انہیں کاتبوں کی سہولت کے لیے ابن قتیبہ نے ایسی معلومات کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کی ضرورت اس زمانہ کے کاتبوں کو ہوا کرتی تھی۔ "مکاتیب ابن قتیبہ" اسی مجموعہ کا نام ہے۔

بہرحال یہ جو کچھ بھی تھا قابلیت کے لحاظ سے تھا۔ اختیارات کے لحاظ سے وہ صرف منشی یا اسٹینوگرافر ہوتا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں تو اس پیشہ کی ابتداء تھی۔ اس وقت اتنی اعلیٰ اور جامع قابلیت کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم مروان کے متعلق حافظ ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں۔ کان من سادات قریش و فضلاءھا (قریش کے عمائدین اور فضلاء میں سے تھا) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر انہیں مروان کے متعلق فرمایا۔ القاری لکتاب اللہ۔ الفقیہ فی دین اللہ الشدید فی حدود اللہ (البدایۃ والنہایۃ ص۲۵۷ ج۸)

حلقۂ محدثین سے بھی ان کا تعلق تھا، چنانچہ متعدد احادیث کی سندوں میں ان کا نام آتا ہے۔

اس علم و فضل کے ساتھ اس کا احساس خود حضرت مروان کو بھی تھا کہ وہ سیاسی جھگڑوں میں پڑ گئے۔

حضرت امام مالکؒ کی روایت ہے کہ (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب حضرت مروان مدینہ طیبہ کے گورنر تھے تو) کہا کرتے تھے (قرأت کتاب اللہ منذ اربعین سنۃ ثم اصبحت فی ما انا فیہ یعنی اهراق الدماء وهذا الشان (البدایۃ والنہایۃ ص۲۵۸ ج۸)

چالیس سال سے قاری کتاب اللہ ہوں۔ پھر ان حالات میں گھر گیا جن میں گھرا ہوا ہوں، یعنی خونریزی اور یہ تمام باتیں۔

بہر حال یہ سب باتیں علمی قابلیت کے لحاظ سے تھیں۔ اختیارات کے لحاظ سے نہ سکریٹری اور نہ چیف سکریٹری کا کوئی عہدہ تھا، نہ اس کے اختیارات تھے، نہ اس کا کوئی اثر پڑ سکتا تھا، البتہ حاضر باش تھے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بے تکلف خادم تھے۔ اسی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی معتمد بیوی نائلہ سے نوک جھونک رہتی تھی۔

اب اگر چچازاد بھائی، منہ چڑھا خادم بھی ہو اور ابن عساکر وغیرہ کی تحقیق کے بموجب وہ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے فرامین اور فیصلے لکھ دیتا ہو (کان کاتب الحکم بین یدیہ۔ البدایہ والنہایہ ص ۲۵۹ ج ۸) تو اس پر کسی کو مشتعل ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے اور اس کو اسباب شورش میں کس طرح شمار کرایا جا سکتا ہے مودودی صاحب کا یہ ارشاد بجا ہے کہ غلط کام کو خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل و انصاف کا تقاضا ہے نہ دین ہی کا یہ مطالبہ ہے کہ کسی صحابی کی غلطی کو غلطی نہ مانا جائے۔ (ص ۱۱۶)

بیشک یہ دین کا مطالبہ نہیں ہے کہ صحابی کی غلطی کو غلطی نہ مانا جائے اور اس کو سخن سازی سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی جائے، مگر کیا یہ دین کا مطالبہ ہے کہ سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر الزام ثابت کرنے کے لیے سخن سازی کی جائے اور جس غلطی سے ان کا دامن پاک ہے، وہ خواہ مخواہ ان کے سر تھوپی جائے۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں نظامِ حکومت پر حاوی سکریٹری اور چیف سکریٹری کا عہدہ گھڑنا اور کاتب کے معنی سکریٹری یا چیف سکریٹری کرنا کیا سخن سازی نہیں ہے اور سخن سازی اس لیے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ مجرم اور ملزم ثابت ہوں۔ (معاذ اللہ)

حکم بن ابی العاص | اسی طرح حضرت مروان کے والد حکم بن ابی العاص کے معاملہ میں بھی مودودی صاحب نے سخن سازی اور آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے۔

مدینہ منورہ سے نکالے جانے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نقلیں اتارنے کے متعلق روایتوں کا ترجمہ تو کر دیا جو موضوع اور ضعیف ہیں اور بعض کے راوی شیعہ اور رافضی ہیں (الاصابہ۔ ص ۲۹۔ ج ۲) لیکن ابن سعد (جن کو بقول مودودی صاحب تمام محدثین نے ثقہ اور قابلِ اعتماد قرار دیا ہے) ان کی تحقیق کو چھوڑ دیا۔

ابن سعد فرماتے ہیں۔

الحکم بن ابی العاص بن امیۃ اسلم یوم الفتح ولم یزل بھا حتی کانت خلافۃ عثمان

ابن عفان فاذن له ان تدخل المدينة فمات بها فى خلافة عثمان (طبقات ابن سعد ص ۳۳۱ ج ۵)

حکم بن ابی العاص بن امیہ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے اور مکہ ہی میں رہے[1]۔ یہاں تک کہ حضرت عثمان کی خلافت کا دور آیا، آپ نے ان کو مدینہ آنے کی اجازت دیدی پھر مدینہ ہی میں ان کی وفات ہوئی۔

مورخ ابن سعد کی تائید علامہ ابن تیمیہ بھی کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

کان لمروان سبع سنین او اقل فما کان له ذنب له يطرد عليه ثم لم نعرف ان اباه هاجر الى المدينة حتى يطرد منها فان الطلقاء ليس فيهم من هاجر فان النبى صلى الله عليه وسلم قال لا هجرة بعد الفتح ولما قدم صفوان بن امية مهاجرا امره النبى صلى الله عليه وسلم بالرجوع الى مكة و قصة طرد الحكم ليس له اسناد تعرف به صحتها۔ (میزان الاعتدال بین الرفض والاعتزال فی دفع مطاعن عثمان ذی النورین ص ۴۹۵ بحوالہ تجدید سبائیت ص ۲۹۰)

ترجمہ: مروان کی عمر سات سال یا اس سے بھی کم تھی۔ لامحالہ ان کا کوئی ایسا گناہ ہو نہیں سکتا تھا کہ ان کو نکالا جائے۔ پھر یہ بات معلوم نہیں ہے کہ ان کے باپ (حکم بن ابی العاص) ہجرت کر کے مدینہ آگئے تھے کہ وہاں سے انکو نکالا جاتا، کیونکہ طلقاء میں کوئی ایسا نہیں ہے جس نے ہجرت کی ہو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے ہی مکہ فتح کیا، اعلان فرمایا تھا کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے اور جب حضرت صفوان بن امیہ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو آپ نے ان کو بھی مکہ واپس چلے جانے کا حکم دیدیا اور الحکم بن ابی العاص کے نکال دینے کا قصہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا۔ اسکی کوئی سند ایسی نہیں ہے جس کی صحت معلوم ہو۔ (میزان الاعتدال ص ۴۹۵) اور خود صاحب واقعہ سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا گیا تو آپ نے اہل مدینہ کے مجمع عام میں جس میں مدینہ طیبہ کے علاوہ کوفہ اور بصرہ کے بہت سے عمائدین موجود تھے فرمایا۔

قالوا انى رددت الحكم وقد سيره رسول الله صلى الله عليه وسلم و الحكم مكى سيره رسول الله صلى الله عليه وسلم من مكة الى الطائف ثم رده رسول الله صلى الله عليه وسلم فرسول الله صلى الله عليه وسلم سيره و رسول الله صلى الله عليه وسلم رده ۔ اكذالك ۔ قالوا ۔ اللهم نعم ۔ (طبری ص ۱۰۲ - ج ۵ - وص ۱۰۳) اعتراض کرنے والوں نے اعتراض کیا ہے کہ میں نے حکم کو واپس لوٹا دیا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نکال دیا

---

[1] یعنی نہ طائف گئے نہ مدینہ آئے۔

تھا، بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مکہ سے طائف روانہ کر دیا تھا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی اس کو واپس بھی کر لیا۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی اس کو روانہ کیا تھا۔ آپ ہی نے اس کو واپسی کی اجازت دی[1]۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حاضرین سے فرمایا (بولو) واقعہ یہی ہے؟ سب نے کہا، بیشک خدا شاہد ہے واقعہ یہی ہے۔

اب سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ مودودی صاحب یا جن کی وہ تقلید کرتے ہیں وہ سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بیان کو تسلیم کیوں نہیں کرتے۔ حالانکہ آپ نے مدینہ طیبہ کے مجمع عام میں یہ ارشاد فرمایا۔ پھر مجمع سے اس کی تصدیق چاہی اور پورے مجمع نے "اللّٰھم" کہہ کر اس کی تصدیق کی۔

روایت کرنے والے حافظ ابن جریر طبری ہیں، جن کو مودودی صاحب مستند ترین مورخ مانتے ہیں۔ ہمارے خیال میں حقیقت وہی ہے جو سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی۔ ان کی کسی غلطی کی بناء پر آپؐ نے مکہ سے خارج کر کے طائف میں قیام کا حکم فرمایا۔ پھر از خود یا حضرت حکم کی معافی کی درخواست پر آپ نے مکہ معظمہ واپس آجانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد ان کی درخواست تھی کہ مدینہ میں آکر قیام کریں۔ آپ نے اس کی اجازت نہیں دی، کیونکہ ہجرت کا سلسلہ اب بند ہو گیا تھا اور آپ اعلان فرما چکے تھے کہ لا ھجرۃ بعد الفتح۔

پھر انہوں نے حضرت صدیق اکبر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں بھی مدینہ آکر قیام کرنے کی اجازت چاہی، ان حضرات نے بھی اجازت نہیں دی۔ اجازت نہ دینے کا سبب معتوبیت نہیں ہے۔ وہ تو اس وقت ختم ہو گیا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مکہ میں واپس آکر قیام کرنے کی اجازت دی۔ اب تو سوال یہ تھا کہ جب سلسلۂ ہجرت منقطع ہو چکا ہے تو مکہ کے کسی باشندے کو مدینہ آکر قیام کرنے کی اجازت دی جائے یا نہیں۔ اس اجازت میں پہلے سختی برتی گئی۔ حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفوان بن امیہ کو مکہ واپس کر دیا۔ یہی سختی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور تک رہی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اب اس ممانعت کی ضرورت نہیں سمجھی، آپ نے اجازت دیدی۔ اس قسم کے احکام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں پھر حضرات شیخین کے دور میں بدلتے رہے۔

افتراء پردازوں نے اس واقعہ پر حاشیہ آرائی کی اور مودودی صاحب نے انہیں حاشیوں کو اس طرح لے لیا گویا یہی واقعات ہیں۔

---

[1] بظاہر یہ مدت اتنی مختصر تھی کہ حضرت حکم سے جن کا قریبی تعلق نہیں تھا ان کو اس جانے آنے کی خبر بھی نہیں ہوئی چنانچہ ابن سعد کے مروی عنہ حضرات نے اس کا بھی ذکر نہیں کیا۔

تعجب ہوتا ہے۔ مودودی صاحب خود فرماتے ہیں۔ "لیپ پوت سے بات بنتی نہیں بگڑ جاتی ہے (ص ۳۰۷)
اور یہاں سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ملزم گردانے کے لیے خود لیپ پوت کر رہے ہیں۔

(مولانا اسحٰق صاحب سندیلوی نے اپنی تصنیف "تجدید سبائیت" میں اس قضیہ کے تمام پہلو بڑی وضاحت سے بیان فرمائے ہیں، دلچسپی رکھنے والے حضرات ملاحظہ فرمالیں)

ہم پہلی مودودی صاحب کی ایک نکتہ آفرینی کی طرف توجہ دلاکر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ مودودی صاحب کی باریک بینی ملاحظہ فرمایئے، آپ فرماتے ہیں۔

خصوصاً جب کہ اس کا معتوب باپ موجود تھا اور اپنے بیٹے کے ذریعہ حکومت کے کاموں پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ (ص ۱۱۱)

ہمارے لیے تو مودودی صاحب کا یہ انداز تحریر بھی لرزہ خیز ہے۔ مروان اور حکم جیسے بھی ہوں ان کو یہ سعادت حاصل تھی کہ سید الانبیاء رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے انور کی زیارت حاصل ہوئی تھی۔ متاع ایمان بھی ان کے پاس تھا۔ شرف مشافہت بھی حاصل ہوا تھا۔ دنیا بھر کے اربوں اور کھربوں انسانوں میں صرف ڈیڑھ یا دو لاکھ انسان ہیں جن کو متاع ایمان کے ساتھ سعادتِ زیارت اور شرفِ ہمکلامی حاصل ہوا انکی یہ سعادت باعثِ رشک اور موجب صد احترام ہے۔ یہ مودودی صاحب ہی کی جسارت ہے کہ ان کے متعلق وُہ انداز اختیار کر رہے ہیں جیسے کسی بازاری شخص کے ساتھ، جو مجرم اور ملزم بھی ہو۔

بہر حال حکومت پر اثر انداز ہونے کا جو نکتہ ان کے دماغ نے اختراع کیا وہ قابل توجہ ہے۔ حضرت حکم کی وفات ۳۲ھ میں ہو چکی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش ۳۴ھ میں شروع ہوئی یعنی حضرت حکم کی وفات سے دو سال بعد۔ ——— گویا وہ وفات سے دو سال بعد بھی اپنے بیٹے کے ذریعہ حکومت کے کاموں پر اثر ڈالتے رہے

عطیہ اور رعایت | حکم بن ابی العاص کے معاملہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں قابلِ اعتراض بنانے کے لیے جس طرح لیپ پوت کی، اس سے بھی زیادہ قابلِ نفرت وہ لیپ پوت ہے جو عطیہ اور رعایت کا الزام ثابت کرنے میں مودودی صاحب نے خود اپنے دست مبارک سے کیے ہیں۔

کتنی رقم تھی جو مروان کو دی گئی جو بقول مودودی صاحب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش کا سبب اور ہدف اعتراض بنی۔ (ص ۱۰۶) کس مد سے دی گئی؟ کس بہانہ سے دی گئی؟

یہ سوالات ہیں مگر ع

"شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیر ہا"

مہربانی فرما کر صرف وہ روایتیں ملاحظہ فرمایئے، جو مودودی صاحب نے پیش فرمائی ہیں اور جن کی کترنوں سے قباء اعتراض تیار کیا ہے۔

(ا) یہ رقم مروان کو پندرہ ہزار کی مقدار میں دی گئی۔ (خلافت وملوکیت ۳۲۸)

(ب) مروان کے لیے مصر کا خمس لکھ دیا (ص ۳۲۶)

سوال یہ تھا کہ جب مروان اس حملہ میں شریک ہی نہیں تھے جو مصر پر کیا گیا تھا تو اس کا خمس مروان کو کیسے مل سکتا تھا۔ تو مودودی صاحب اس کی تاویل یہ فرما رہے ہیں (یعنی افریقہ کے اموال غنیمت کا خمس، جو مصر کے صوبہ کی طرف سے آیا تھا۔ (ص ۳۲۶)

(ج) تو کیا جنگِ افریقہ میں مروان شریک تھے؟ شریک نہیں تھے تو خمس کیسا؟ جواب کے لیے آپ نے ابن خلدون کا دامن پکڑا کہ۔

"ابن خلدون نے یہ لکھا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ مروان نے یہ خمس پانچ لاکھ کی رقم میں خرید لیا تھا اور حضرت عثمان نے یہ قیمت اسے معاف کر دی"۔ (ص ۳۲۶ حاشیہ)

(د) یہ خرید و فروخت کب ہوئی؟ اور اس کا کیا ثبوت کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے معاف فرما دی اور کیا معاف کر دینے کا ان کا حق[1] تھا؟

سوالات پیچیدہ تھے۔ مودودی صاحب نے ادھر ادھر ہاتھ پیر مارے تو اتفاق سے ابن اثیر کا دامن ہاتھ آگیا۔ فرماتے ہیں اس واقعہ کے متعلق ابن اثیر نے اپنی تحقیق اس طرح بیان کی ہے۔

"عبداللہ بن سعد بن ابی سرح افریقہ کا خمس مدینہ لائے اور مروان بن حکم نے اسے پانچ لاکھ میں خرید لیا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ قیمت اس کو معاف کر دی۔ یہ بھی ان امور میں سے ہے جن کی وجہ سے حضرت عثمانؓ پر اعتراض کیا جاتا تھا۔ افریقہ کے خمس کے معاملہ میں جتنی روایات بیان کی جاتی ہیں۔ یہ روایت ان میں سب

---

[1] خلفائے راشدین کے عمل یا قول دلیل ہوا کرتے ہیں۔ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ عطیہ ثابت ہو جاتا تو حضراتِ فقہاء اس دلیل سے کام لیتے — محمد میاں

سے زیادہ درست ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان نے افریقہ کا خمس عبداللہ بن سعد کو دیدیا تھا اور بعض دوسرے لوگ بیان کرتے ہیں کہ مروان بن حکم کو عطا کر دیا تھا۔ اس روایت سے حقیقت یہ ظاہر ہوئی کہ حضرت عثمان نے افریقہ کی پہلی جنگ کا خمس عبداللہ بن سعد کو عطا کیا تھا اور دوسری جنگ کا (جس میں افریقہ کا پورا علاقہ فتح ہوا) اس کا خمس مروان کو عطا کیا (تاریخ الکامل ج ۳ ص ۴۶ ابن اثیر)

مودودی صاحب سے دریافت کیا جائے کہ آپ پہلے تو فرماتے ہیں کہ مروان نے پانچ لاکھ میں خرید لیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ پانچ لاکھ معاف فرما دیئے۔ پھر فرماتے ہیں دوسری جنگ میں جس میں افریقہ کا پورا علاقہ فتح ہوا اس کا خمس مروان کو عطا کیا۔

خمس عطا کر دیا تھا تو اس کو فروخت کرنے، پھر قیمت معاف کر دینے کے کیا معنی؟ اور کیا مروان اس دوسری جنگ میں شریک تھے جو ان پر یہ مہربانی فرمائی گئی کہ پورا خمس ان کو بخش دیا۔

اگر فروخت کیا تھا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قیمت معاف کر دینے کا کیا حق تھا۔ اگر اس کا کوئی بھی قابلِ اعتماد ثبوت ہوتا تو فقہاء کرام کے لیے یہ عمل ایک فقہی نظیر ہوتا، کیونکہ خلیفۂ راشد کا عمل بھی دلیل ہوتا ہے۔

تعجب ہے۔ ان کو حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کس قدر بُعد ہے، اور انہیں خلیفۂ مظلوم سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اوپر الزام ثابت کرنے کا کتنا شوق ہے کہ اس شوق میں وہ اپنی فہم و فراست کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔

بغض کی انتہاء ہو گئی کہ الزام ثابت کرنے کے لیے تو مضحکہ انگیز متضاد بیانات کو بھی جوڑنے کی کوشش کرتا ہے اور خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ارشاد گرامی کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے جو آپ نے مدینہ طیبہ میں اجتماع عظیم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا اور پورے مجمع نے اس کی تصدیق کی تھی۔ کوئی ایک آواز بھی اس کے خلاف نہیں اٹھی تھی آپ نے فرمایا۔

اما اعطاھم فانی ما اعطیھم من مالی ولا استحل اموال المسلمین لنفسی ولا لاحد من الناس (طبری ص ۱۰۳۔ ج ۵) جہاں تک ان کو دینے کا تعلق ہے تو میں جو کچھ ان کو دیتا ہوں اپنے مال میں سے دیتا ہوں اور مسلمانوں کے مال نہ میں اپنے لیے جائز سمجھتا ہوں نہ کسی بھی انسان کے لیے۔

ہر ایک ذی علم جانتا ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں تنقید کا طریقہ نہیں ہے۔ وہ اس جنگل میں ہر ایک رطب و یابس

کو جگہ دیدیتے ہیں۔ حتیٰ کہ امام بخاری رحمہ اللہ جن کی تحقیق وتنقید کا یہ عالم ہے کہ انکی کتاب بخاری شریف کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ مانا جاتا ہے۔ وہ جب تاریخ کے میدان میں آتے ہیں تو انہیں کی مرتب فرمودہ "تاریخِ کبیر" گویا ایک نخلستان ہے جس میں درختوں سے زیادہ جھاڑ ہیں اور درختوں میں بار آور بھی اور بے برگ وبار بھی۔

لیکن مودودی صاحب جن کا بلند بانگ دعویٰ یہ ہے۔

"میں کسی بزرگ کے کسی غلط کام کو غلط اسی وقت کہتا ہوں جب وہ قابلِ اعتماد ذرائع سے ثابت ہو اور کسی معقول دلیل سے اس کی تاویل نہ کی جاسکتی ہو" (ص ۳۰۷)

کیا یہ روایتیں جو قیاس اور درایت کے بھی خلاف ہیں اور خود آپس میں بھی متضاد اور متناقض، کیا اس قابل ہیں کہ ان پر اعتماد کر کے اس مقدس شخصیت پر الزام ثابت کیا جائے۔ جس کو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین سوم ہونے کا شرف حاصل ہے اور جس کو صادق مصدوق کی لسانِ رسالت نے الشہید فرمایا۔ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ان بے سروپا روایتوں پر اعتماد کیا جائے اور خود اس شہید مظلوم کی بات کو تسلیم نہ کیا جائے جو اس نے مجمع عام میں فرمائی تھی اور پورے مجمع نے اس کی تصدیق کی تھی کہ۔

"مسلمانوں کے مال نہ میں اپنے لیے جائز سمجھتا ہوں نہ کسی بھی انسان کے لیے (طبری ص ۱۰۳ - ج ۵)

کیا کوئی بھی صاحبِ انصاف ________________ اس ظلم کی اجازت دے سکتا ہے۔ (معاذ اللہ)۔

بقیہ: سیرۃ نبوی اور مستشرقین

استثنا باب ۷ میں ہے۔ جس شہر پر جہاد کرو تو مارو ان کو یہاں تک کہ ان میں سے کوئی نہ بچے اور ان کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ کرو۔ اور نہ ان پر رحم کرو۔ اسی طرح جہاد یوشع باب ۱۱ و صفر سموئیل باب ۱۲ و جہاد داؤد باب مذکور میں ہے کہ ان کو قینچی اور چھریوں سے کاٹو۔ (۴) ۱۳ رسائل کا مجموعہ ۱۸۳۹ء میں جو بیروت میں چھپا ہے اس میں لکھا ہے کہ رومانیہ کے کلیسا نے تیس ہزار دوسو پروٹسٹنٹ عیسائیوں کو پوپ کو اپنا پیشوا نہ ماننے پر زندہ آگ میں جلایا۔ (ماخوذ از الجواب الفصیح الخ)

(باقی آئندہ انشاء اللہ)

الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

مولفہ: قاضی ابو الفضل عیاض بن موسیٰ الاندلسی
مترجمہ: محترم نور محمد صاحب غفاری ایم اے، بہاولنگر

الباب الاوّل

فی ثناء اللہ تعالیٰ علیہ واظہارہ عظیم قدرہ لدیہ

تیسری فصل

{ اُن آیات واحادیث کے بارے میں کہ جن میں لطف الٰہی اور برأت کے ساتھ آنجناب علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر ہوا ہے۔ }

پہلی آیت

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۔ (التوبہ۔ ۴۳)

اللہ تمہیں معاف کر دے تو نے انہیں کیوں اجازت دیدی۔ یہاں تک کہ تم پر واضح ہو جاتا کہ ان میں کون (اپنے عذر میں) سچے ہیں اور کون جھوٹے۔

ابو محمدؒ اس آیت کے ضمن میں فرماتے ہیں۔ "یہاں عفا اللہ عنك" کے الفاظ سے اس کلام کی ابتداء ہو رہی ہے (جو اللہ تعالیٰ جناب صلی اللہ علیہ وسلم سے کرنا چاہتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ کا ان مبارک الفاظ عفا اللہ عنك ــــ سے ابتدا کرنا ایسا ہی ہے جیسے (کوئی بزرگ یا مشفق اپنے عزیز کو تنبیہ کرتے ہوئے کہتا ہے) اللہ تیری اصلاح فرمائے اور تجھے عزت عطا فرمائے (تو نے ایسا کیوں کیا، آئندہ نہ کرنا)

حضرت عون بن عبد اللہ فرماتے ہیں۔ "اللہ تعالیٰ نے جناب صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی غلطی جتلانے سے قبل آپ کی بخشش کی خبر دی۔

حضرت ابو اللیث سمرقندی نے بعض علماء سے "عفا اللہ عنك" کا یہ مفہوم حکایت کیا ہے۔ "اے سلیم القلب!

آپ نے ان منافقین کو کیوں اجازت دی؟" پھر یہی حضرت ابواللیث سمرقندیؒ فرماتے ہیں۔"اگر اللہ تعالیٰ نے جناب صلی اللہ علیہ وسلم سے "عفا اللہ عنک" (اللہ تمہیں معاف کرے) نہ فرماتے بلکہ یوں فرماتے "لم اذنت لھم" (آپ نے انہیں اجازت کیوں دی؟) تو آپ پر لرزہ طاری ہو جاتا اور آپ کا سینہ مبارک عتاب الٰہیہ (کے خوف) سے پھٹ جاتا، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خاصہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (آپ کی لغزش بتانے سے قبل) بخشش کی خبر سنا دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک سکون و قرار سے بھر گیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔" آپ نے انہیں بیٹھا رہنے (اور جنگ میں حصہ نہ لینے) کی اجازت کیوں مرحمت فرمائی۔ یہاں تک کہ آپ معلوم کر لیتے کہ ان میں سے کس کا عذر درست ہے اور کس کا لنگ"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے اس طرح خطاب فرمانے (یعنی وعید سے قبل اعلان معافی) سے اللہ تعالیٰ کے ہاں جناب صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بلندیٔ مرتبت اور علو شان کا پتہ چلتا ہے جو کسی عقلمند سے ڈھکی چھپی نہیں (یعنی اس سے زیادہ کسی کی عظمت و شان کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی خطا بتانے سے قبل اس خطا کی معافی کا مژدہ سنا دیا جائے (واللہ اعلم) [1]

آیت کا پس منظر | اس آیت کریمہ میں غزوۂ تبوک کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض لوگوں (جن میں اکثریت منافقین کی تھی) کے جنگ میں حصہ نہ لینے کی اجازت دینے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ غزوہ رجب سنہ ۹ھ کو ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پاک کا یہ آخری غزوہ تھا۔ اس غزوہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس غزوہ کے وقت مسلمان نہایت تنگ دست تھے۔ حتیٰ کہ ان میں سے اکثر کے پاس پہننے کو جوتیاں تک نہیں تھیں اور گرمی سخت تھی۔ لہٰذا صحابہ کرام نے گھاس پھوس کی جوتیاں تیار کیں تاکہ پاؤں کو جھلسنے سے بچائیں، چونکہ گھاس پھوس کو عربی میں تبوک کہتے ہیں، لہٰذا اس غزوہ کا نام تبوک پڑا۔ نیرنگیٔ عالم تو دیکھیے، قیصر روم سے لڑنے جا رہے ہیں اور پاؤں میں جوتی تک نہیں۔ ویسے تبوک ایک جگہ کا نام بھی ہے جہاں یہ غزوہ لڑا گیا تھا۔ اس لیے بھی اسے غزوۂ تبوک کہتے ہیں، یہ لڑائی نہایت سخت تھی۔ سفر بھی دور کا تھا۔ مدینہ منورہ میں کھجور کے پکنے کا زمانہ زور پر تھا کہ سارے باغ پکے ہوئے تھے اور مدینہ والوں کی زندگی کا دارومدار انہی کھجوروں پر تھا۔ گویا سخت آزمائش کا وقت تھا۔ لہٰذا اب کھوٹے اور کھرے کی پرکھ کا وقت تھا۔ منافقین آکر عذر کرتے اور آپ ان کے ظاہر پر ترس کھا کر انہیں اجازت دیتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (غفاری عفی عنہ)

اللہ تعالیٰ کے اس طرزِ خطاب سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز و اکرام مترشح ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس طرح آپ سے جو حسنِ سلوک فرمایا ہے اس کی نوعیت، کیفیت اور کمیت تک انسانی عقل کی رسائی نہیں۔

نفطویہؒ کہتے ہیں کہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں جناب صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے مامون رکھے (آمین)، یہ رائے غلط ہے، کیونکہ عتاب تو غلطی پر ہوتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے (منافقین اور دیگر معذرین کو اجازت دینے کا) اختیار دیا گیا تھا۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں (منافقین) کو اجازت مرحمت فرما رہے تھے اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ فرما دیا تھا کہ اگر آپ انہیں اجازت نہ دیتے تب بھی یہ لوگ اپنے نفاق کی وجہ سے (مجاہدینِ تبوک کا ساتھ نہ دیتے بلکہ) بیٹھے رہتے۔ لہٰذا انہیں اجازت دینے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر کسی قسم کا الزام نہیں آتا۔

فرائض مؤمن کامل فقیہ قاضی ابوالفضلؒ "اللہ ان سے اچھائی کا معاملہ فرمائے"، کہتے ہیں کہ :-

۱۔ ہر کامل مسلمان — جس کا نفس (رضائے الٰہیہ کی خاطر) مجاہدہ کرنے والا ہے اور جس کی عادت شریعت مطہرہ کی پیروی کرتے ہوئے ریاضت کرنے کی ہے — پر واجب ہے، کہ وہ اپنی گفتار، اپنے کردار، اپنے معاملات اور شبانہ روز معمولات میں قرآنی آداب سے اپنے اخلاق کو مہذب اور شائستہ[1] بنائے، کیونکہ قرآن مجید ہی علوم حقیقی کی اصل ہے اور یہ ایک ایسا باغ ہے جس میں دینی اور دنیوی آداب کے پھول کھلتے ہیں۔

۲۔ اور ایسے کامل مسلمان کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ، جو سب کا پروردگار ہے جو ہر کس و ناکس پر نعمت کرنے والا ہے اور تمام مخلوق سے بے نیاز ہے۔ سے سوال کرتے وقت اسی قسم کے عجیب و غریب لطائف و عنایات کا امیدوار رہے۔ جس قسم کی اس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کی لغزش سے آگاہ کرنے سے پہلے معافی کا اعلان کیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کرم فرمائیں تو تمام مومنین سے اسی قسم کا معاملہ فرما سکتے ہیں لہٰذا

---

[1] دراصل یہاں قاضی صاحب کامل مؤمن کو عفو، بردباری، وسیع القلبی، علو نفسی اور رحم و کرم کا درس دینا چاہتے ہیں اور یہ آیت بطور نمونہ پیش کرتے ہیں کہ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لغزش کتنے احسن طریقہ پر معاف فرمائی کہ آپ کو محسوس ہی نہیں ہوا۔ بلکہ دلجوئی کے لیے خطا پر آگاہی سے قبل مغفرت کی خبر دی۔ لہٰذا ہر کامل مؤمن کو چاہیئے وہ "تخلقوا باخلاق اللہ" کے تحت اپنے بھائیوں کی غلطیاں معاف کرتا رہے (واللہ اعلم)

کامل مؤمن کو اس قسم کی امید بوقتِ دعاء ضرور رکھنی چاہیئے۔ (واللہ اعلم)

اور اس آیت قرآنی ۔ عفا اللہ عنک لم اذنت لھم ۔ میں جو "دینی اور دنیوی" فوائد ہیں ان کی اقتداء کی جائے۔

دیکھیے کیسے اللہ تعالیٰ نے (اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرمانے کے لیے) کلام کی ابتداء کی ہے کہ آپ پر عتاب کرنے سے قبل آپ کا اکرام کیا ہے (کہ بخشش کی خبر دیدی) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی غلطی پر مطلع کرنے سے قبل بخشش کی خبر سنا کر آپ کو مانوس کر لیا۔

دوسری آیت

وَلَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا

(بنی اسرائیل ۷۴)

اور اگر آپ کو ہمارا تحفظ (از گناہ) حاصل نہ ہوتا تو قریب تھا کہ آپ ان (کفار کے مطالبہ) کیطرف جھک جاتے۔ [1]

متکلمین مفسرین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو جب کبھی ان سے لغزش سرزد ہوئی لغزش کے وقوع کے بعد ان کی سرزنش کی، مگر جناب صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ خصوصی عنایت ہے کہ انہیں لغزش کرنے سے پہلے ہی تنبیہ کی جارہی ہے تاکہ اس طریقہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم گناہوں کے ترک کرنے میں زیادہ طاقتور اور محبت کے تقاضوں پر مداومت کرنے والے بن جائیں اور یہ عنایت الٰہیہ کی انتہا ہے کہ لغزش کرنے سے

---

[1] آیت کا پس منظر | کفار نے جناب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تنگ آکر کہا کہ اچھا آپ ہمارے بتوں کی برائی بیان نہ کریں۔ اس کے بدلے میں ہم آپ کو خزانوں کا مالک بنا دیں گے یا اپنا سردار تسلیم کر لیں گے اور اگر آپ چاہیں تو عرب کی حسین ترین لڑکی کے ساتھ آپ کی شادی کر دیں۔ اس کے جواب میں پیارے سردار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اگر تم لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دو۔ میں تب بھی اللہ کی بات سنانے سے باز نہیں آؤں گا۔" کفار کھسیانے ہو کر لوٹ گئے ۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ "اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ہمارا ہی کام تھا کہ ہم نے تمہیں ثابت قدم رکھا۔ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللھم لا تکلنی نفسی طرفۃ عین اے اللہ! مجھے پلک جھپکنے کی مقدار بھی میرے نفس کو نہ سونپ۔

(مترجم۔ غفاری عفی عنہ)

پہلے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہہ فرمادی پھر دیکھیے تو سہی کہ (کفار کی طرف مائل ہونے پر جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لغزش ہوتی اور اسکی وجہ سے جو عتاب نازل ہونا تھا اس کے بیان سے قبل خیر پر آپکی ثابت قدمی اور برائی سے سلامتی (جو صرف اللہ تعالیٰ کے خاص فضل وکرم سے ممکن تھی) کا ذکر کیا اور پھر یہ خوف دلایا کہ کہیں آپ ان کفار کی طرف مائل نہ ہوجائیں اور آپ کی لغزش کے عتاب سے پہلے ہی آپ کی پاکیزگی کا اعلان کردیا اور لغزش پر (عتاب کے خوف سے قبل آپ کے لیے امن کا مژدہ سنایا اور آپ کی بزرگی کامل ہونے کی اطلاع دی۔

تیسری آیت

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ

(انعام - ۳۳)

ہم جانتے ہیں کہ یہ کافر لوگ جو کچھ آپ کو کہتے ہیں اس سے آپکو ملال ہوتا ہے، مگر وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم تو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا انکار کرتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابوجہل نے جناب صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "یقین جانیے ہم آپ کو ہرگز نہیں جھٹلاتے بلکہ اس قرآن کو۔ جو توحید کا علمبردار ہے۔ جھٹلاتے ہیں جسے آپ لیکر آئے ہیں اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

ایک دوسری روایت میں یوں آیا ہے کہ جناب صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی قوم نے جھٹلایا تو آپ کو ملال ہوا۔ جبرائیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ "آپ کو کس بات کا ملال ہے؟ فرمایا۔ "میری قوم میری تکذیب کرتی ہے"۔ جبرائیل امین نے کہا۔ "آپ کی قوم اس امر سے بخوبی واقف ہے کہ آپ "سچ" ہیں۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

حضرت قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ جناب صلی اللہ علیہ وسلم کو (کفار کے مقابلہ میں) جو طمانیت قلب عنایت فرمایا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز واکرام تھا یہ آیت فانھم لایکذبونک الخ — اس کا نہایت لطیف ماخذ ہے، کیونکہ اس آیت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اقرار فرمایا کہ آپ کفار کے نزدیک سچ ہیں اور وہ آپکو نہیں جھٹلاتے بلکہ آپ کے سچے ہونے کے زبان اور اعتقاد (دل) دونوں سے معترف ہیں اور آپ کے عہدہ نبوت پر فائز ہونے سے قبل وہ آپکو امین کے نام سے پکارتے تھے۔

قاضی صاحبؒ مزید فرماتے ہیں کہ اس مندرجہ بالا تقریر کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جناب صلی اللہ علیہ وسلم سے

اس قلق (رنج، دکھ) کو دُور کیا ہے جو آپ کو کفار کے جھٹلانے کی وجہ سے ہوتا تھا (کیونکہ یہ ملال کا ہونا ایک فطری بات تھی)

پھر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ہی اعلان نہیں کیا۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید مطمئن کرنے کے لیے یہاں تک فرمادیا کہ وہ ظالم لوگ تو اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں (نہ کہ آپ کے سچے ہونے کا) اس طرح اللہ تعالیٰ نے جناب صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا ہونے کے عیب سے بچایا اور کفار پر الزام لگایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو محض معاندہ (عناد) کی بناء پر جھٹلاتے ہیں۔

حقیقت المعاندۃ جناب قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں۔ "معاندہ (عناد) کی حقیقت کسی شئے کو اس کے (صحیح ہونے کے علم کے باوجود (محض عناد کی وجہ سے) جھٹلانا ہے (یہ کفار کی اخلاقی برائی تھی) اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۔ (سورۂ نمل)

اور ان کافروں نے قرآن حکیم کا انکار ظلم (جو انکی فطرت ثانیہ بن چکا تھا) اور تکبر کی وجہ سے کیا حالانکہ انکے قلوب اسکی حقانیت کے قائل تھے۔

پھر خداوند قدوس نے دیگر انبیاء علیہم السلام کی اولوالعزمی اور ثابت قدمی کے واقعات سناکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے شدائد کے مقابلہ میں تحمل اور پامردی کی دولت سے نوازا اور کفر و شرک کی پیدا کردہ وحشت کو آپ سے زائل کرکے سکونِ قلب بخشا (لہٰذا آپ کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی) اور اعداء اسلام کے مقابلہ میں آپ کی مدد کا وعدہ فرمایا۔ آپکی دلجمعی کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ (دل برداشتہ نہ ہوجیئے) آپ سے پہلے رسولوں کو بھی جھٹلایا گیا۔

لایکذبونک کی مختلف قرأتیں

یہاں دو قرأتیں مذکور ہیں۔

(۱) پہلی قرأت بالتخفیف۔ اس کے مطابق مندرجہ ذیل مختلف حضرات کی طرف منسوب ہیں۔

ا۔ بعض حضرات (مثلاً جناب نافعؒ اور الکسائیؒ) جنہوں نے "یکذبونک" کی "ذ" کو تخفیف کے ساتھ (بغیر تشدید کے) پڑھا ہے۔ ان کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے۔ "وہ آپ کو جھوٹا نہیں پاتے۔"

ب۔ جناب فراء نحوی کوفیؒ اور الکسائیؒ (کی ایک دوسری قرأت) کے مطابق اس آیت کے معنی یہ ہیں "وہ (کفار) یوں نہیں کہتے کہ آپ جھوٹے ہیں۔"

ج ۔ بعض نے یہ معنی کیے ہیں ۔ "وہ آپ کے جھوٹا ہونے پر کوئی دلیل نہیں لاسکتے" (لہٰذا) وہ آپ کا جھوٹا ہونا ثابت نہیں کرسکتے ۔"

دوسری قراءت

۲۔ دوسرے تمام قراء نے "یکذبونکَ" کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے ۔ اس قراءت کی رو سے اس آیت کے معنی یہ ہیں ۔

ا ۔ وہ آپ کی طرف جھوٹ منسوب ہی نہیں کرتے ۔

ب ۔ وہ آپ کے جھوٹا ہونیکے متعلق اعتقاد ہی نہیں رکھتے ۔

خصائص کبریٰ | آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص کبریٰ میں سے یہ بھی ہے کہ دیگر انبیاء کرام کو اللہ تعالےٰ نے ان کے نام سے مخاطب کیا ہے ۔ مثلاً

یٰاٰدَمُ اَنْبِئْھُمْ بِاَسْمَآئِھِمْ : اے آدم علیہ السلام انہیں ان اشیاء کے نام بتاؤ

یٰنُوْحُ اھْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا : اے نوح ! ہماری طرف سے سلامتی سے (اس کشتی سے) اتر جا ۔

یٰاِبْرَاھِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا : اے ابراہیم تم نے خواب سچا کر دکھایا ۔

یٰمُوْسٰی اِنِّیْ اَنَا اللّٰہ : اے موسیٰ ۔ یقیناً میں ہی اللہ ہوں ۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً : اے داؤد ! ہم نے تمہیں اپنا نائب مقرر کیا ۔

یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ : اے عیسیٰ ! میں تمہیں پورا پورا لینے والا ہوں ۔

یٰزَکَرِیَّا اِنَّا نُبَشِّرُکَ : اے زکریا ہم تمہیں خوشخبری دیتے ہیں ۔

یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتَابَ بِقُوَّۃٍ : اے یحییٰ ! کتاب کو مضبوطی سے تھام لو ۔

مگر جناب صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے آپ کا نام مبارک لیکر نہیں پکارا بلکہ ۔

یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ (اے نبی) یَا اَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ (اے کمبل میں لپٹے ہوئے) یا ایھا المدثر (اے چادر میں لپٹے ہوئے) وغیرہ کے پاک خطابات سے مخاطب فرمایا (یہ آپ پر اللہ کا خاص انعام تھا ۔)

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے

مولانا ابوالکلام آزاد

حقیقتِ اسلامی کی آزمائش

اللہ اللہ اس نیرنگ سازِ ازل کے کاروبارِ محبّت کی بوقلمونی کو کیا کہیے کہ اس کے حریمِ محبت کی ساری آرائش دوستوں کے خون کے چھینٹوں اور مضطرب لاشوں کی تڑپ ہی سے ہے۔ دوستوں کو کٹواتا ہے، مگر دشمنوں کو مہلت دیتا ہے۔ باپ کے ہاتھ میں چھری دیتا ہے کہ بیٹے کو قتل کرے اور بیٹے سے کہتا ہے کہ خوش خوش گردن جھکادے کہ یہاں جان دینا ہی نہیں۔ بلکہ جان دینے کو روزِ عیش و نشاط سمجھنا بھی شرط ہے۔

حقیقتِ اسلامی کی آخری، مگر اصلی آزمائش کا وقت آیا تو وہ "اسلام" ہی تھا جس نے ابراہیمؑ کے ہاتھ میں چھُری دی تاکہ فرزندِ عزیز کو ذبح کرکے محبتِ ماسوی اللہ کی قربانی کرے اور "اسلام" ہی تھا جس نے اسمٰعیلؑ کی گردن جھکادی۔ تاکہ اپنی جانِ عزیز کو اسکی راہ میں قربان کردے۔ جب کہ اس نے پوچھا:

اے فرزندِ عزیز۔ میں نے خواب دیکھا ہے کہ گویا تجھے اللہ کے نام پر ذبح کر رہا ہوں۔ پھر تیرے خیال میں یہ بات کیسی ہے۔ (قرآنِ مجید)

یہ وجودِ ابراہیمی کی نہیں، بلکہ اسلام ہی کی صدا تھی اور پھر جب اس کے جواب میں اسمٰعیلؑ نے کہا:

"اے باپ یہ تو گویا اللہ کی مرضی اور اس کے حکم کا اشارہ ہے۔ پس جو اس کا حکم ہے اس کو بلا تأمّل انجام دیجئے۔ اگر یہی خدا کی مرضی ہوئی تو آپ دیکھ لیں گے کہ مَیں صبر کرنے

والوں میں سے ہوں گا۔ (قرآن مجید)

تو یہ بھی اسماعیلؑ کی نہیں بلکہ "اسلام" ہی کی صدا تھی۔ پھر جب ابراہیمؑ نے بیٹے کو مینڈھے کی طرح سختی سے پکڑ کر زمین پر گرا دیا۔ تو وہ اسلام ہی کا ہاتھ تھا جو ابراہیمؑ کے اندر سے کام کر رہا تھا اور جب بیٹے نے اس شوق و ذوق کے ساتھ جو مدتوں کے پیاسے کو آبِ شیریں سے ہوتا ہے، اپنی گردن مضطرب ہو ہو کر چھری سے قریب کر لی۔ تو وہ حقیقتِ اسلامی کی محویت کا استیلا تھا۔ جس نے نفسِ اسمٰعیلؑ کو فنا کر دیا تھا اور اسی فنا سے مقامِ ایمان کو بقا ہے۔

"پس سلام ہو حقیقتِ اسلامی کی قربانی کرنے والے ابراہیمؑ پر، ہم مقامِ احسان تک پہنچنے والوں کو (بقائے دوام کا) ایسا ہی بدلا عطا فرماتے ہیں۔ بیشک وہ ہمارے حقیقی بندوں میں سے تھا۔" (قرآن مجید)

غافل مرو کہ دررہ بیت الحرام عشق
صد منزل است و منزلِ اوّل قیامت است

اللہ اللہ اس نیرنگ سازِ ازل کے کاروبارِ محبت کی بوقلمونی کو کیا کہیے کہ اس کے حریمِ محبت کی ساری آرائش دوستوں کے خون کے چھینٹوں اور مضطرب لاشوں کی تڑپ ہی سے ہے۔ دوستوں کو کٹواتا ہے، مگر دشمنوں کو مہلت دیتا ہے۔ باپ کے ہاتھ میں چھری دیتا ہے کہ بیٹے کو قتل کرے اور بیٹے سے کہتا ہے کہ خوش خوش گردن جھکا دے کہ یہاں جان دینا ہی نہیں بلکہ جان دینے کو روزِ عیش و نشاط سمجھنا بھی شرط ہے۔

آہ! ایں چہ دوستیست کہ سرہائے یک دگر
خویشاں بریدہ بر رہِ قاتل نہادہ اند

ابراہیمؑ کے دل میں اپنی محبت کے ساتھ بیٹے کی محبت گوارا نہ ہوئی اور اسمٰعیلؑ کے پہلو میں اپنے گھر کو دیکھا تو محبت نفس و جان کی پرچھائیں نظر آئیں۔

عشق است و ہزار بدگمانی

غیرتِ الٰہی نے اس کو بھی منظور نہیں کیا۔ حکم ہوا کہ پہلے محبت کے مکان کو ایک ہی مکین کے لیے خالی کر دو پھر اس طرف نظر اٹھا کر دیکھنا کہ محبت کی عشق آموزی کا پہلا سبق ہی یہ ہے اور یہی معنی ہیں کہ:۔

"اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں سے درگذر کر سکتا ہے، مگر اس کو کبھی معاف نہیں کر سکتا، کہ تم اسکی محبت میں کسی دوسرے کو شریک کرو۔ (قرآن مجید)

سلطانِ محبت تمام گناہوں کو معاف کر سکتا ہے، مگر اس کی عدالت میں دل کی تقسیم کا کوئی قانون نہیں ہے، آپ کا دوست ہزار لجج ادائیاں کرے آپ کا دل محبت پرست اس کی شفاعت سے باز نہ آئے گا، لیکن آپ اس گوشۂ نظر سے کیونکر درگذر کر سکتے ہیں جو آپ کی طرف نہیں بلکہ دوسری جانب تھی؟ آپ کسی کی آنکھوں کی بے مہری کو تو گوارا کر سکتے ہیں، لیکن اس خمار کو کیونکر دیکھ سکتے ہیں جو محبتِ غیر کی شب بیداریوں سے پیدا ہوا ہو؟ اگر کبھی اس کوچے میں گزر ہوا ہے تو اپنے دل سے پوچھ لیجیے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ البتہ اس مسئلے کے سمجھنے کے لیے مدرسہ سے باہر بھی کچھ سیکھنا ضروری ہے۔

کیں مسئلہ در نسخۂ محمود و ایاز ست

پس قسم ہے اس خدائے سلام کی جس نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی قربانی کو برکت بخشی اور اس کو ملّت حنفی کے لیے "اسوۂ حسنہ" بنایا کہ دو نام اور ایک ہی معنی کے لیے دو مترادف الفاظ ہیں اسلام کے معنی "جہاد" ہیں اور "جہاد" کے معنی "اسلام"۔ پس کوئی ہستی "مسلم" ہو نہیں سکتی جب تک کہ مجاہد نہ ہو اور کوئی مجاہد ہو نہیں سکتا جب تک کوئی "مسلم" نہ ہو۔ "اسلام" کی لذت اس بدبخت کیلیے حرام ہے جس کا ذوق ایمانی لذت جہاد سے محروم ہو اور زمین پر گو اس نے اپنا نام مسلم رکھا ہو، لیکن اسکو کہدو کہ آسمانوں میں اسکا شمار کفر کے زمرے میں ہے۔ جبکہ ایک دنیا "لفظِ جہاد" کی دہشت سے کانپ رہی ہے۔ جبکہ عالم مسیحی کی نظروں میں یہ لفظ ایک عفریتِ مہیب یا ایک حربۂ بے امان ہے۔ جبکہ اسلام کے مدعیانِ حمایت نصف صدی سے کوشش کر رہے ہیں کہ کفر کی رضا کے لیے اسلام کو مجبور کریں کہ اس لفظ کو لغت سے نکال دیں۔ جبکہ بظاہر انہوں نے کفر و اسلام کے درمیان ایک راضی نامہ لکھ دیا کہ اسلام لفظ جہاد کو بھلا دیتا ہے۔ کفر اپنے توحش کو بھول جاتے اور جبکہ آجکل کے ملحدین مسلمین اور متفرنجین مفسدین کا ایک "حزب الشیطان" بے چین ہے کہ بس چلے تو یورپ سے درجۂ تقرب عبودیت حاصل کرنے کے لیے سرے سے اس لفظ کو قرآن سے نکال دے، تو پھر یہ کیا ہے کہ میں نہ صرف "جہاد" کو ایک رکن اسلامی، ایک فرضِ دینی، ایک حکم شریعت بتلاتا ہوں بلکہ صاف صاف کہتا ہوں کہ اسلام کی حقیقت ہی جہاد ہے۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اسلام سے اگر جہاد کو الگ کر لیا جائے تو وہ ایک لفظ ہوگا، جس میں معنی نہیں ہے۔ ایک اسم ہوگا جس کا مسمّی نہیں ہے۔ ایک قشر محض ہوگا جس سے مغز نکال لیا گیا ہے۔ پھر کیا میں ان تمام اعمالِ مصلحینِ متفرنجین کو غارت کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے تطبیق بین التوحید والتثلیث یا اسلام اور مسیحیت کے عقدِ اتحاد کے لیے انجام دی ہیں؟ وہ اصلاح جدید کی شاندار عمارتیں جو مغربی تہذیب و شائستگی کی ارضِ مقدس پر کھڑی کی گئی ہیں، کیا دعوتِ جہاد دیکر جنودِ مجاہدین کو بلاتا ہوں کہ اپنے گھوڑوں کے سموں سے انہیں پامال کر

دیں اور پھر کیا چاہتا ہوں کہ اسلام کی زندگی کا افق جو حرارتِ حیات کی گرد سے پاک کر دیا گیا تھا، مجاہدین کی اڑائی ہوئی خاک سے پھر غبار آلود ہو جائے ؟

ہاں ! اے غارت گرانِ حقیقتِ اسلامی !

اے درندانِ متاعِ ایمانی ! اور اے مفسدینِ ملّت و مدعیانِ اصلاح ! ہاں مَیں ایسا ہی چاہتا ہوں، میری آنکھیں ایسا ہی دیکھنا چاہتی ہیں، میرا دل ایسے وقت کے لیے بے قرار ہے۔ خدائے ابراہیم و محمدؐ (علیہما السلام) کی شریعت ایسا ہی چاہتی ہے۔ قرآنِ کریم اس حقیقت کو اسلامی کہتا ہے، وہ اسوۂ حسنہ کی طرف اپنے پیروؤں کو بلاتا ہے اسلام کا اعتقاد اس کیلئے ہے۔ اس کی تمام عبادتیں اسی کے لیے ہیں، اس کے تمام جسم، اعمال کی روح یہی شے ہے اور یہی چیز ہے جس کی یاد کو اس نے ہمیشہ زندہ رکھنا چاہا اور "عیدالاضحیٰ" کو یومِ جشن و مسرت بنایا۔

پس یہ ہے جس کی طرف مَیں مسلمانوں کو بلاتا ہوں۔ پھر تمہارے پاس کیا ہے ؟ جس کی طرف تم ہم کو دعوت دیتے ہو۔

یا ان کا ارادہ مکر و فریب پھیلانے کا ہے ؟ اگر ایسا ہے تو یاد رکھیں کہ یہ منکر خود شیطان کے فریب میں پڑے ہیں۔ یا پھر خدا کے سوا ان کا کوئی اور معبود ہے۔ اگر یہی بات ہے تو یقین کرو کہ اللہ کی ذات اُن کے اس شرک سے پاک ہے۔ (قرآن مجید) ◆◆

انجمن دارالعلوم الشہابیہ سیالکوٹ کا

علمی، دینی اور اصلاحی مجلّہ

ماھنامہ **الرشاد** سیالکوٹ

زیرِ سرپرستی، حضرت مولانا محمد علی صاحب صدیقی کاندھلوی صدر انجمن

عنقریب شائع ہو رہا ہے

• دینی اور روحانی قدروں کا ترجمان • ایک تحریک • ایک ولولۂ تازہ • ڈائجسٹ سائز • سفید کاغذ • دیدہ زیب ٹائیٹل • آفسیٹ طباعت۔

مدیر ماہنامہ الرشاد، دارالعلوم الشہابیہ رنگپورہ روڈ۔ سیالکوٹ

• اسلامی پیڈ

خط لکھنے کے لیے اسلامی پیڈ، ختمِ نبوت کی احادیث اور پرچم نبویؐ سے مزین۔

• عمدہ کاغذ • رنگین چھپائی

—— : قیمت : ——

۲۵ کاغذ مجلد —— پچاس پیسے

۵۰ کاغذ مجلد —— ایک روپیہ

۱۰۰ کاغذ مجلد —— دو روپے

محصول ڈاک ۲۰ پیسے فی پیڈ علاوہ، وی پی نہیں ہوگا رقم یا ٹکٹ پیشگی، رجسٹری کے پچاس پیسے کے ٹکٹ مزید۔

ملنے کا پتہ

محمد رمضان میمن، مدرسہ تعلیم الفرقان، جامع مسجد توحید، توحید نگر چاکیواڑہ۔ کراچی نمبر ۲۔

مولوی حافظ عبد الرشید لاہوری
متعلم جامعہ مدنیہ لاہور

منصبِ نبوّت

زمانۂ نبوت سے جس قدر بعد ہوتا جارہا ہے اسی قدر ضلالت و گمراہی کی اشاعت اور شریعتِ غرّاء کی تعلیمات سے اجتناب اور روگردانی بلکہ ملّت بیضاء کے اصول اور اس کے بنیادی عقائد کے بطلان کے لیے شیاطین جنّ و انس کی سرگرمیاں بڑھتی جارہی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ وہی دور آچکا ہے جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیش گوئی فرمائی تھی کہ قربِ قیامت میں ایمان سے ہٹا دینے والے فتنوں کی اتنی کثرت ہوجائیگی کہ اگر انسان صبح کو مؤمن ہے تو شام کو کافر ہوجائے گا اور اگر شام کو مؤمن ہے تو صبح کو کافر اٹھے گا۔ دورِ حاضر کے گمراہ کن فتنوں میں سے ایک جگر دوز و زہرا گداز فتنہ انکارِ حدیث کا فتنہ ہے، لیکن چودہ سو سال سے پوری امت کا حجیّتِ حدیث پر متفق ہونا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اس قسم کے لچر اور بیہودہ اعتراض جو آج منکرین حدیث کر رہے ہیں، بے بنیاد ہیں اور ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ ساری امّت اسلامیہ کسی امر غیر واقعی پر متفق ہوجائے اور اس بات سے منکرین حدیث بھی بے خبر نہیں ہیں، چنانچہ جب وہ جواب و سوال کرتے کرتے اس مرحلہ پر آجاتے ہیں تو اس کے لیے انہوں نے ایک اور چور دروازہ بھی تلاش کر رکھا ہے کہ اگر ان کے عائد کردہ اعتراضات کا جواب دیدیا جائے تب بھی انہیں حدیث سے راہ فرار اختیار کرنے میں کوئی دقّت پیش نہ آئے اور وہ یہ ہے کہ احادیث تشریعی اہمیت کی حامل نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت ایک تاریخ کی سی ہے، چنانچہ منکرین حدیث رقمطراز ہیں۔ "الغرض حدیث کا صحیح مقام دینی تاریخ کا ہے۔ اس سے تاریخی فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں، لیکن دین میں حجت کے طور پر وہ نہیں پیش کی جاسکتی۔" (مقام حدیث ص۱۴۱ طبع جدید) چونکہ حدیث کی تشریعی حیثیت کے انکار سے رسول کی تشریعی حیثیت کا بھی انکار کرنا پڑتا ہے۔ اسلیے منکرین حدیث نے رسول کی تشریعی حیثیت کا انکار کرکے اُسے ایک عام امیر و حاکم کے برابر کردیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں "خدا کے احکام قرآنِ کریم میں منضبط تھے اور رسول اللہ بہ حیثیت مرکز نظام خداوندی ان احکام کی اطاعت حالات کے تقاضے کے مطابق افراد معاشرہ سے کراتے تھے۔"

لہٰذا اس فاسد عقیدے کی تردید کے لیے ہمیں قرآن پاک کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ قرآن پاک حضور علیہ السلام کو بطور ایک ایسے مرکز ملت (امیر و حاکم) کے پیش کرتا ہے کہ جس کا منصب رسالت تبلیغِ قرآن پر ختم ہوجاتا ہے

اور اس کے بعد وہ اور ملت کے دیگر مراکز سب برابر ہیں یا بطور ایک ایسے جلیل القدر پیغمبر کے پیش کرتا ہے جو دیگر تمام انبیاء سے افضل ہیں اور جن کا اتباع رہتی دنیا تک پوری امت کے لیے فرض۔ حضرت مولانا بدر عالمؒ صاحب نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ خصوصیات جو انکو ایک عام امیر و حاکم سے ممتاز کرتی ہیں۔ بڑے عمدہ پیرائے میں بیان فرمائی ہیں میں اختصاراً ذکر کرتا ہوں۔

(۱) اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (پ ۱۷۔ع ۱۷) اللہ تعالیٰ فرشتوں اور انسانوں میں رسول اپنی ہی پسند سے بناتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسولوں کا تقرر خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ امیر و حکام کی طرح انکا تقرر مخلوق نہیں کرتی۔ مخلوق کے مشوروں کی بھی اس بارے میں کوئی رعایت نہیں کی جاتی اور نہ ہی انہیں اس کا حقدار سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے جب کفارِ مکہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت میں اپنی رائے زنی شروع کی تو سخت لہجہ میں ان کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا۔

اَھُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَۃَ رَبِّکَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَھُمْ مَّعِیْشَتَھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔

(کیا یہ لوگ آپکے رب کی رحمت کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں حالانکہ دنیوی زندگی میں انکا رزق ہم نے تقسیم کیا ہے)

یعنی نبوت و رسالت روحانی غذا ہے، کیونکہ اگر نبوت کے ذریعہ ہدایت کا راستہ نہ دکھایا جاتا تو تمام جن و انس روحانی طور پر موت کے آغوش میں چلے جاتے۔ لہٰذا جب جسمانی غذا کی تقسیم اللہ نے صرف اپنے ہی قبضہ میں رکھی ہے (جس کا کفار کو اقرار ہے) جس کو جتنا چاہتا ہے دیتا ہے اس میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں تو معلوم ہوا کہ روحانی غذا کی تقسیم بھی بطریق اولیٰ صرف خدائے بزرگ و برتر کا حق ہے جسے چاہے نبوت و رسالت سے سرفراز فرمائے اس میں بھی کسی کو چوں چرا کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبوت کو رحمت سے تعبیر کر کے ایک اور جواب کی طرف لطیف سا اشارہ فرما دیا کہ نبوت تو ایک رحمت ہے لہٰذا رحمت کی تقسیم کا حق بھی صرف رحمٰن ہی کو ہو سکتا ہے، جو خود رحمت میں دوسرے کے محتاج ہوں وہ نبوت جیسی بڑی رحمت کی تقسیم کے ٹھیکیدار کیسے بن سکتے ہیں۔ اب فرمایئے کہ مرکز ملت کا انتخاب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یا جناب کے ووٹ؟ ؎

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

(۲) اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (پ ۸۲) یہ بات خدا ہی خوب جانتا ہے کہ اسے اپنا رسول کسے بنانا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ منصب رسالت صرف ایک وہبی منصب ہے اس میں کسی کے کسب کو کوئی دخل نہیں یعنی

عبادات و ریاضات سے یہ مقام حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ جسمیں چاہے نبوت و رسالت کی اہلیت رکھ دیتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ منصب جن خصوصیات کی بناء پر مرحمت ہوتا ہے ان کا علم بھی سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں۔ امام اور امیر کی خصوصیات معلوم ہیں اس کا انتخاب بھی مسلمانوں کے سپرد ہے اور اس لیے انکے معزول کر دینے سے وہ معزول ہو جاتا ہے۔ اب منکرین حدیث بتائیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا انتخاب لوگوں نے کیا تھا اور کیا مسلمان انکو اپنے منصب سے معزول کر سکتے تھے؟ اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کیونکر ایک امیر اور حاکم کے مساوی کیا جا سکتا ہے ؎

ٹھوکریں مت کھائیے چلیے سنبھل کر دیکھ کر
چال سب چلتے ہیں، لیکن بندہ پرور دیکھ کر

(۳) چونکہ قدرت ان کا انتخاب خود ہی کرتی ہے اس لیے ان کی تعلیم کا انتظام بھی خود ہی کرتی ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (پ ۳۰) پڑھیے اس پروردگار کے نام کی برکت سے جس نے آپ کو پیدا کیا۔

کیا منکرین حدیث کے مقرر کردہ مرکز ملت کی تعلیم کا انتظام اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں؟

(۴) اللہ تعالیٰ پڑھانے کے بعد یاد بھی کراتے ہیں۔ اگر کچھ بھولتا ہے تو وہ بھی اسی کی مشیت کے ماتحت ہوتا ہے۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ۔ (پ ۳۰) ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے بجز اسکے جس کو خدا چاہے۔

(۵) جس طرح رسول کی تعلیمی تربیت کا انتظام منجانب اللہ ہوتا ہے۔ اسی طرح انکی اخلاقی تربیت بھی اللہ تعالیٰ خود ہی فرماتے ہیں۔ اسی لیے عین بداخلاقی کے دور میں وہ ایسے بلند اخلاق کے مالک ہوتے ہیں جہاں دنیا اپنے پورے عروج کے بعد بھی نہیں پہنچ سکتی۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا (پ ۲۱) لوگوں کے ساتھ بے رخی نہ کیجیے اور زمین پر اترا کر نہ چلیے۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ۔ (پ ۱۴) مومنوں کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آیئے۔

لَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ۔ اور نہ اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کے ساتھ بندھا ہوا رکھ اور نہ اسکو پوری طرح کھولدے (بلکہ خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کر)

(۶) جس طرح اللہ تعالیٰ انکی تعلیمی اور اخلاقی نگہبانی کرتا ہے اسی طرح کبھی انکی جسمانی تحفظ کی ذمہ داری بھی لے لیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

واللہ یعصمک من الناس (پ ۶) اللہ تعالیٰ آپکو لوگوں سے محفوظ رکھیں گے۔

حدیث بطور تاریخ کے چونکہ منکرین حدیث بھی تسلیم کرتے ہیں اس لیے ایک حدیث کا واقعہ بھی اس آیت کے ذیل میں پڑھ لیجیے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس آیت کے نزول سے پیشتر رات کو آپ کے خیمہ کا پہرہ دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد آپ نے وہ پہرہ منسوخ کر دیا اور خیمہ سے منہ باہر نکال کر فرمایا کہ جاؤ میری حفاظت کا اللہ تعالےٰ کفیل ہو چکا ہے۔

(۷) اس سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ ان کے عواطف اور میلان قلبی کی بھی نگرانی فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

ولولا ان ثبتنٰک لقد کدت ترکن الیھم شیئاً قلیلاً (پ ۱۵) اگر ہم آپکو تھام نہ لیتے تو آپ کچھ نہ کچھ ان کی طرف جھک جاتے۔

چونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے عزائم اور افعال تو درکنار قلبی خطرات بھی قدرت الہیہ کے زیر نگرانی رہتے ہیں۔ اس لیے امت ان کے متعلق معصوم ہونے کا عقیدہ رکھتی ہے۔ رسول نبی کے علاوہ کسی اور امیر و حاکم کے متعلق عصمت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ پیغمبر جس کے دل وساوس اور خطرات بھی قدرت الہیہ کے زیر نگرانی رہتے ہوں اسکو ایک عام امیر و حاکم کے برابر کر دینا اس کی کتنی بڑی توہین ہے، لیکن کیا کیا جائے ہدایت دینا بندہ کے اختیار میں نہیں۔ ؎

گہر جو دل میں نہاں ہیں خدا ہی دے تو ملیں
اسی کے پاس ہے مفتاح اس خزانے کی

(۸) اس ربانی تعلیم و تربیت، عصمت اور ہمہ وقت کی نگرانی کی وجہ سے اسکی جو بات ہوتی ہے خواہش نفس سے پاک اور صاف ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (پ ۲۷) وہ (نبی) خواہش نفسی سے نہیں بولتا۔ اسکا بولنا نہیں ہوتا سوائے اس وحی کے جو اس پر بھیجی جاتی ہے۔ اس آیت کو قرآن کے ساتھ خاص کرنا بدترین قسم کی جہالت یا خیانت ہے، کیونکہ قرآن پڑھنے کے لیے تمام قرآن میں تلاوت یا قرأت کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ کسی بھی جگہ قرآن پڑھنے کیلیے لفظ نطق نہیں بولا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وما ینطق کا مفعول محذوف ہے لہٰذا قاعدۂ بلاغت کی رو سے یہاں مفعول مقصود ہی نہیں بلکہ محض پاکیزگی نطق بتلانی مقصود ہے خواہ کوئی سا ہی نطق کیوں نہ ہو۔ خواطر قلبی

کی نگرانی اور پاکیزگیٔ نطق سے لازم آتا ہے کہ اگر وہ اپنی رائے سے بھی کوئی فیصلہ کریں تو وہ بھی عین حق ہوگا جیسے کہ دوسری آیت میں اسکی تصریح بھی ہے۔

(۹) خواہشاتِ نفس سے پاکیزگی، خطرات ورائے کی عصمت کی وجہ سے وہ عالم کے لیے مجسم نمونۂ عمل بن جاتے ہیں۔ یہاں حق وناحق کی تفصیل۔ نیکی اور معصیت کی تقسیمیں سب ختم ہوجاتی ہیں۔ وہ جو بھی کہہ دیتے ہیں سب خواہشات نفس سے پاک اور جو کرتے ہیں وہ سب نیکی ہی نیکی ہوتی ہے اس لیے ان کی ہستی آنکھ بند کرکے قابلِ اتباع ہوتی ہے۔ سوائے ان امور کے جو نبی کے ساتھ خاص ہوں۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (پ۲۱) تمہارے لیے حضور علیہ السلام کی ذات اقدس میں بہترین نمونۂ عمل موجود ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بعض کاموں میں صحابہ کرام نے حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ سے بھی پوچھ گچھ کی اور ان سے اختلاف کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خلاف شریعت ہونے کی صورت میں مرکز ملت کے کسی کام سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن نبی نے جو کہہ دیا اور جو کر دیا وہی شریعت بن گیا۔ کسی دوسرے کو یہ مقام حاصل نہیں۔

رخِ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزمِ خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

(۱۰) نبی کے قلب میں امت کی اتنی محبت ہوتی ہے کہ امتیوں کو خود اپنی جانوں سے بھی نہیں۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (پ۲۱) نبی مؤمنین کے ساتھ خود ان کے نفسوں سے بھی زیادہ محبت رکھتے ہیں۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (پ ۱۹) شاید آپ اپنی جان ہی ہلاک کردیں گے اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔

(۱۱) امت پر اس کا اتنا احترام واجب ہوتا ہے کہ اس کی بیبیاں مؤمنین کی مائیں بن جاتی ہیں اور نبی کی وفات کے بعد ان سے نکاح درست نہیں۔ نبی کے سامنے آگے بڑھ کر کوئی بات کرنا امت کے لیے ممنوع ہے اور اس کے سامنے اونچی آواز سے بولنا یا عام انسانوں کی طرح آوازیں دینا تمام اعمال کے ضائع ہوجانے کا سبب ہوتا ہے۔

خدائی محبت کا دعویٰ ان کے اتباع کے بغیر قابلِ قبول نہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی (پ ۳) آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں واقعی اللہ سے محبت ہے تو

میری پیروی کرو۔

(۱۳) رسول مجلس مشاورت کی رائے کا تابع نہیں۔ دوسرے لوگ اس کے تابع ہوتے ہیں۔

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (پ ۴) جب آپ پختہ ارادہ فرمالیں تو خدا پر بھروسہ کر کے اسے کر گزریئے۔

اس کے برعکس امام اور امیر کو مشیروں کے مشورہ کی پابندی کرنا ہوگی اور بصورت اختلاف رائے اپنی بات کو قرآن و حدیث سے ثابت کرنا ہوگا اور اپنے مشیروں کو مطمئن کرنا ہوگا، لیکن رسول جب کسی امر پر پختہ عزم کر لے تو دوسروں کو مطالبۂ دلیل کا حق نہیں بلکہ سر تسلیم خم کرنا ہوگا۔

داریم باخلاص سرے برخط تسلیم
باقول نبی چوں وچرا رانہ شناسیم

ان آیات کو بار بار پڑھیں اور بنظرِ غائر پڑھیں اور پھر منکرین حدیث کا یہ عقیدہ بھی ملاحظہ کریں کہ "اطاعت صرف خدا کی کیجا سکتی ہے اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت جائز نہیں"۔ چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں "احادیث کی حفاظت کا ذمہ نہ خدا نے لیا اور نہ ہی انہیں رسول اللہ نے منضبط اور محفوظ کر کے امت کو دیا۔ اس امر کی بدیہی شہادت ہے کہ احادیث کی رو سے اطاعتِ رسول نہ منشائے خداوندی تھا، نہ مقصودِ رسول اللہ"۔

(مقام حدیث ص ۶۴)

اگرچہ سابقہ آیات اس عقیدۂ فاسدہ کی تردید کے لیے کافی ہیں، لیکن چند وہ آیات جنمیں اطاعتِ رسول کو خوب اجاگر کیا گیا ہے اور اس کی حیثیت اور اہمیت بتائی گئی ہے۔ مزید ذکر کی جاتی ہیں تاکہ مسئلہ کی حقیقت خوب واضح ہو جائے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (پ ۵) اے مومنین اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے حکام کی۔ پھر اگر تم جھگڑا کرو کسی معاملہ میں تو اسے خدا و رسول کے سامنے پیش کرو۔

اس آیت میں تین اطاعتوں کا ذکر ہے۔ ۱۔ اللہ کی اطاعت۔ ۲۔ رسول کی اطاعت۔ ۳۔ امراء کی اطاعت اگر رسول بھی ایک مرکز ملت یعنی امیر کی حیثیت رکھتا تھا تو اطاعتِ رسول کو اطاعتِ امراء سے علیحدہ ذکر کرنے کے کیا معنی؟ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ رسول کی حیثیت اور اس کا مقام امراء سے بلند و بالا اور خدا سے نیچے ہے۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ اللہ کی اطاعت کی طرح رسول کی اطاعت بھی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ اسکے

برعکس امام اور امیر کی اطاعت، اطاعتِ مستقلہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر امیر کا حکم قرآن وسنت ثابتہ کے خلاف ہو تو اس کی اطاعت نہیں کی جائیگی اور اسی کو واضح کرنے کے لیے رسول کے ساتھ اطیعوا کا لفظ مکرر لایا گیا ہے اور اطاعتِ امیر کو خدا اور رسول کی اطاعت کے ماتحت کر دیا گیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ امراء سے منازعت ہو سکتی ہے، لیکن اللہ اور اس کے رسول سے منازعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور نیز یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ بصورتِ منازعت فیصلہ کرانے کے لیے مرجع دو ہیں ایک اللہ تعالیٰ اور دوم اس کا رسول، پس جسطرح اللہ تعالیٰ کی طرف مراجعت کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسکی کتاب کی طرف مراجعت کی جائے۔ بعینہٖ اسی طرح رسول کی طرف مراجعت کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آپکی سنت کی جانب مراجعت کی جائے۔ اگرچہ آپ کے زمانہ میں آپکی ذات اقدس کی طرف بھی مراجعت کی جاتی تھی، لیکن بایں ہمہ اکثر و بیشتر زمانۂ رسالت میں بھی پیش آمدہ مسائل میں حضور علیہ السلام کی سنت اور احادیث کی طرف مراجعت ہوتی تھی، کیونکہ یہ غیر ممکن تھا کہ پورے جزیرۂ عرب کے تمام لوگ ہر مسئلہ میں حضور علیہ السلام کی طرف رجوع کریں، اس لیے حضور علیہ السلام کے مقرر کردہ حکام اور قاضی اور جو لوگ آپکی خدمت اقدس میں رہ کر مسائل سیکھ لیتے تھے اپنے اپنے علاقوں میں جاکر دوسرے لوگوں کو آپ کے فرامین وارشادات بتاتے تھے اور وہ لوگ ان پر عمل کرتے تھے۔ بہرحال یہ بات واضح ہو گئی کہ اطاعتِ خداوندی کی طرح اطاعتِ رسول بھی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ بخلاف اطاعت امراء کے، اگر منکرین حدیث کے قول کے مطابق اطاعت رسول سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام کی اطاعت کی جائے جو صاف اور واضح طور پر قرآن پاک میں موجود ہیں تو پھر اطیعوا الرسول کا کوئی مفہوم ہی باقی نہیں رہتا، کیونکہ یہی معنی تو اطیعوا اللہ کے ہیں لہٰذا اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ اطاعت رسول کی ایک مستقل حیثیت ہے یعنی آپ کے ہر حکم کا اتباع کیا جائے خواہ اسکی اصل قرآن میں ہمیں ملے یا نہ ملے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ بعض سنتوں کی اصل قرآن میں نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا مکلف ہی نہیں بنایا کہ رسول کے حکم کی اصل قرآن میں ہم تلاش کریں۔ بخلاف اطاعتِ امیر کے کہ وہ اسی وقت کیجائے گی جبکہ اس کے حکم کی اصل قرآن یا سنت رسول میں پائی جائے۔ اس سے اطاعت رسول کے مستقل ہونے اور اطاعتِ امیر کے غیر مستقل ہونے کے معنی خوب واضح ہو گئے۔ باقی رہا منکرین حدیث کا اطاعت رسول سے اطاعت امیر مراد لینا (مقام حدیث ص۶۵) تو نہ معلوم یہ کونسی لغت ہے، لیکن بہرحال ہے۔ یہ کوئی عجیب وغریب ہی لغت، جو اطیعوا الرسول کے معنی تو بدل کر رکھ دیتی ہے اور منکرین حدیث کی بگڑی ہوئی قسمت بنا دیتی ہے، لیکن امنوا باللہ ورسولہ میں اپنا کوئی کرشمہ نہیں دکھاتی، ورنہ کیا وجہ ہے کہ رسول پر ایمان لانے کے معنی امیر پر ایمان لانے

کے نہیں کیے جاتے۔ ؏

بریں عقل و دانش بباید گریست

اور منکرین حدیث کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں دو حیثیتیں نکالنا اور یہ کہنا کہ پیغمبری اور رسالت کی حیثیت سے رسول کا اتباع نہیں کیا جاتا بلکہ ایک امیر ہونے کی حیثیت سے آپ کا اتباع لازم ہے (ملاحظہ ہو مقام حدیث ص۱۲۸) لہٰذا آپ جب تک امیر تھے آپکا اتباع ضروری تھا اور دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد جو امیر ہوگا اسکی پیروی کی جائے گی، کیونکہ اتباع رسول کا زمانہ ختم ہوگیا تو یہ سراسر تحریف قرآن ہے، کیونکہ جب احکام قرآنیہ قیامت تک آنے والے تمام انسانی افراد پر لاگو ہیں اور ان پر احکام قرآنیہ کا اتباع ضروری و فرض ہے تو اطاعت رسول کو صرف زمانۂ حیات نبوی میں کیونکر محصور اور مقید کیا جاسکتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ دو حیثیتیں قرآن میں کہیں مذکور نہیں اور نہ ہی ان دونوں کے احکام علیحدہ علیحدہ ذکر کیے گئے ہیں اور نہ ہی کہیں تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ صحابۂ کرام نے حضور علیہ السلام کے ساتھ دو مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے دو قسم کے معاملات کیے ہوں۔ بلکہ آپ کا ہر فعل بہ حیثیت رسالت تھا۔ آپ معلم و مزکی بھی تھے، آپ شارح کتاب اللہ اور قاضی بھی تھے، آپ شارع قوانینِ شریعت اور حاکم و فرمانروا بھی تھے، لیکن سب کچھ بحیثیت رسالت تھے، گویا کہ یہ سب کام اجزائے رسالت اور اس کے مختلف شعبے تھے اور من جانب اللہ یہ تمام امور فرائض رسالت میں سے تھے، لہٰذا ان میں سے کسی بھی کام کو حیثیتِ رسالت سے جدا کر کے تصوّر نہیں کیا جاسکتا اور اسی حیثیت رسالت سے آپکی پیروی اور اطاعت فرض ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنی عادتِ مستمرّہ ذکر فرماتے ہیں۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (پ ۵) ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا، مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ اللہ کے حکم سے، مگر تعجب ہے منکرین حدیث پر جو کہ بڑے فخر سے اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ اتنی واضح آیت کے ہوتے ہوئے بھی یہ کہتے ہیں کہ رسول کی اطاعت ہی نہیں کی جاتی ؏

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

یہ تو تھا اطاعت رسول کا اثباتی پہلو، اب چند وہ آیات بھی ملاحظہ فرمالیں جن سے اطاعت نہ کرنے پر انجام بد کا پہلو بھی سامنے آجائے۔ والعیاذ باللہ

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (پ ۲۲)

جب خدا و رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو پھر کسی مؤمن مرد یا عورت کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور جو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی نافرمانی کرے تو وہ یقیناً صریح گمراہی میں جا پڑا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (پ ۵)

آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ مومن نہونگے جب تک کہ آپس کے اختلافات میں آپ ہی کو حکم نہ بنائیں۔ پھر آپ کے فیصلہ سے اپنے دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور پوری طرح سر تسلیم خم نہ کر دیں۔

ان آیات سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جسطرح اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے بعد کسی مؤمن مرد و عورت کو سوائے اتباع کے اور کسی قسم کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ بعینہٖ اس طرح حضور علیہ السلام کے فیصلہ کے بعد بھی کسی ایمان لانے والے مرد و عورت کو بجز اطاعت و فرمانبرداری کے کوئی چارۂ کار نہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص حضور علیہ السلام کے فیصلوں کو پوری کشادہ دلی کے ساتھ قبول نہیں کرتا بلکہ اپنے قلب میں تنگی محسوس کرتا ہے تو ایسے شخص کے لیے اللہ تعالیٰ بقسم فرماتے ہیں کہ یہ مومن نہیں ہے۔ اب آپ خود غور فرمائیں کہ کیا اطاعتِ امیر بھی یہی مقام رکھتی ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو ایسے لوگوں کو سوچنا چاہیئے کہ وہ کہیں اس آیت کے عموم میں تو داخل نہیں ہیں؟

يُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا أُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ حَقًّا۔ (پ ۶)

چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کے منکر ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان راستہ اختیار کریں۔ ایسے لوگ یقیناً کافر ہیں۔ اس آیت سے یہ بات واضح ہو گئی۔ کہ جو ایمان خدا و رسول کے درمیان تفریق پر مبنی ہو اور جس میں اطاعت رسول سے انکار کیا جا رہا ہو وہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے ہاں معتبر نہیں۔ سچ ہے۔ ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

جناب اختر راھی ایم اے

مولانا مناظر احسن گیلانی

مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم موجودہ صدی کے عظیم اسلامی متکلم، مفکر اور مورخ تھے۔ ان کے بزرگ دو ڈھائی صدی پہلے عرب سے ایران ہوتے ہوئے برصغیر پاک و ہند وارد ہوئے۔ اس خاندان کی ایک شاخ نے ضلع پٹنہ میں ایک بستی "گیلانی" کے نام سے بسائی۔ اگر اس بستی میں مولانا مناظر احسن جیسی نادرۂ روزگار ہستی نے جنم نہ لیا ہوتا تو عین ممکن ہے کہ اسکی شہرت ضلع پٹنہ کی حدود سے متجاوز نہ ہوتی۔ مولانا موصوف ۱۸۹۲ء میں اس بستی میں پیدا ہوئے اور یہیں ابدی نیند سو گئے مولانا کے نام کے ساتھ گیلانی" اسی بستی کی نسبت ہے یہ ہرگز باطنی نسبت یعنی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے متعلق نہیں۔

مولانا کا خاندان ذی وجاہت تھا۔ مالی فارغ البالی اور علمی اعتبار سے گرد و نواح کے دیہات میں نمایاں تھا۔ ان کے والد ماجد ابوالخیر صاحب زمینداری میں مشغول تھے اور ہل سہاگے کے بند و بست میں لگے رہتے تھے مگر ان کے چچا ابوالنصر صاحب شعر و سخن کی مجلسیں جماتے اور علم و فضل کی محفلیں برپا کرتے تھے۔ ان کے جد امجد سید محمد احسنؒ اس علاقے میں جید عالم ہو گزرے ہیں۔ غالباً انہی کے نام کی مناسبت سے ان کا نام رکھا گیا تھا۔

مولانا موصوف کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں راجپوتانہ کی مسلم ریاست ٹونک بھیج دیئے گئے۔ جہاں خیر آبادی سلسلہ کے "چراغ سحر" اور جامع معقولات مولانا سید حکیم برکات احمد کی مسندِ درس علم کے پروانوں کو سمیٹے ہوئے تھی۔ مولانا مناظر احسن نے ان سے چھ سال تک دینی علوم کے علاوہ منطق و فلسفہ کا درس لیا۔ کچھ عرصہ اجمیر میں مولانا ٹونکیؒ کے شاگرد مولانا معین الدین اجمیری سے بھی مذاکراتی استفادہ کیا۔ لہذا انہیں بھی "استاذی" کہہ کر یاد کرتے تھے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد حدیث کی تحصیل کے لیے دار العلوم دیوبند میں داخل ہوتے اور سر آمدِ روزگار علماء سے استفادہ کیا۔ دو سال میں فراغت پائی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے نہ صرف ترمذی اور بخاری کا درس لیا بلکہ ان سے بیعت بھی کی۔ مولانا انور شاہ کاشمیری سے "مسلم" کا درس لیا۔ مولانا دورِ تعلیم میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے اپنے اساتذہ کے منظورِ نظر تھے۔ دورۂ حدیث کے اختتام کے ساتھ ہی دار العلوم کے ماہانہ مجلہ "القاسم" سے منسلک ہو گئے۔ یہ تعلق ۱۳۲۷ھ

سے لے کر ۱۳۳۹ھ تک قائم رہا۔ دارالعلوم کے آرگن کے کرتا دھرتا" بننے کا شرف مولانا کے لیے کچھ کم نہ تھا۔

حیدر آباد دکن میں نظام نے اردو یونیورسٹی "جامعہ عثمانیہ" کے نام سے قائم کی تھی جو اپنے مخصوص طرزِ تعلیم کی وجہ سے ہندوستان بھر میں اپنی مثال آپ تھی اور روز بروز ترقی کر رہی تھی۔ روز افزوں ترقی کے ساتھ شعبۂ دینیات میں ایک عالم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اتفاقاً مولانا گیلانی حیدر آباد گئے اور اپنے دَور کے بڑے مفسّر مولانا حمید الدین فراہیؒ سے ملاقات ہوئی۔ مولانا فراہیؒ نے ان کی ذات میں جوہرِ قابل تلاش کر لیا اور جامعۂ عثمانیہ چلے آنے کی خواہش کا اظہار کیا، مگر مولانا گیلانی دارالعلوم دیوبند چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے، مگر جب خود دیوبند کے بزرگوں نے اس مشورے کی تائید کی تو وہ جامعۂ عثمانیہ جانے پر رضامند ہو گئے۔ ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) میں لیکچرار دینیات کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ ترقی کرتے کرتے ریڈر بنے، پروفیسر ہوئے اور آخر کار کئی سال تک صدر شعبہ کے فرائض انجام دیکر ۱۳۶۸ھ (۱۹۴۹ء) میں ریٹائر ہوئے اور وظیفہ یاب بھی۔

حیدر آباد دکن میں مولانا کو حمید الدین فراہیؒ کی صحبت میسر آئی۔ مطالعہ قرآن میں ان سے مدد لی انکی طرزِ فکر اور اعتدالِ نگاہ، فراہیؒ کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ مولانا گیلانی حیدر آباد کے قیام کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "یہ کور نصیب گو حیدر آباد میں پیدا نہیں ہوا تھا، مگر میرے جسم میں جو کچھ ہے حیدر آباد ہی کا ہے۔ اب بھی حیدر آباد ہی میرے سدِ رمق کا ذریعہ ہے۔ پھر اپنی محبوب تعلیم گاہ ہے ہماری جامعہ عثمانیہ جس میں میرے دماغ و دل نے آنکھیں کھولیں۔ اسی کے ماحول میں میری پرورش ہوئی[1]

مولانا وسعتِ نظر، علمی تبحّر اور دینی مسائل میں دسترس کی وجہ سے شعبۂ اسلامیات کی روح رواں تھے۔ اساتذہ اور طلباء میں یکساں مقبول تھے۔ یونیورسٹی کی سینٹ مولانا کے وجود کو اتنا قیمتی خیال کرتے تھے کہ مدت ملازمت میں توسیع ہو سکتی تھی، مگر سقوطِ حیدر آباد نے دنیا ہی بدل ڈالی۔ نئی سیکولر ہندی حکومت نے شعبۂ دینیات کو اڑا دیا اور لادینی نظامِ تعلیم میں عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے "شعبۂ اسلامیات" قائم کیا گیا جو جامعہ کے اعلیٰ مقاصد کے پیش نظر بے حقیقت تھا۔ چنانچہ مولانا اس جبری تنزّل سے دِل برداشتہ ہو گئے اور مدتِ ملازمت کے دن پورے ہوتے ہی وطن چلے آئے اور خو ان کے بقول کہفی زندگی بسر کرنے لگے۔

---

[1] مکتوب بنام غلام محمد (شائع شدہ بیّنات جلد دوم)

وطن واپس آنے کے بعد انکی زندگی کا "دورِ تنہائی" شروع ہوا۔ اس فرصت میں ہمہ تن تصنیف و تالیف میں لگ گئے۔ ہزاروں صفحات لکھ ڈالے، ان کا قلم خوب جولانی دکھاتا رہا، مگر کہنی زندگی نے اُن کا سکون لُوٹ لیا۔ سیّد سلیمان ندوی مرحوم کی مجلسِ ماتم میں شرکت کے لیے لکھنؤ گئے۔ وہاں سے واپسی پر دوسرے یا تیسرے روز مکان میں چوروں کی کافی تعداد گھُس گئی۔ جو کچھ ساتھ لیجا سکتی تھی لے گئی۔ مولانا گیلانی کے الفاظ میں "صبح کو جب آنکھ کھلی تو آنکھیں کھل گئیں"۔ ادھر مولانا کے اکلوتے صاحبزادے پاکستان میں مقیم تھے۔ ان کی طرف سے بھی فکرمند تھے۔ ضعیفی میں مسلسل کام، بیٹے کی جدائی اور غم آلام نے گھیر لیا۔ ۱۹۵۳ء کے آخر میں قلبی شکایت کا حملہ ہوا، مگر فوری علاج معالجہ سے افاقہ ہوگیا۔ ۱۹۵۴ء میں چند ماہ بعد شکایت عود کر آئی اور حملہ اتنا شدید ہوا کہ ڈاکٹروں نے تصنیف و تالیف پر مکمل پابندی عاید کر دی۔ مولانا کا قلم پہلے حملے کے بعد اپنی پوری رفتار سے چل پڑا تھا، دل کے ہاتھوں رُک گیا۔ دو سال تک تندرستی اور بیماری کے درمیان کشمکش چلتی رہی۔ اس دور کے خطوط میں مولانا نے اس زندگی کو "برزخی زندگی" سے تعبیر کیا، لکھتے ہیں۔

"علالت کی مختصر منزلوں سے گزرتا ہوا اب ایک خاص نقطہ پر پہنچ گیا ہوں۔ نہ بیمار ہی ہوں نہ تندرست۔ چاہیئے تو یہی تھا کہ اپنے پیش روؤں کے ساتھ اب تک شریک ہو جاتا، لیکن بقول اکبرؔ ؎

کمزور ہے میری صحت بھی، کمزور ہے میری بیماری
اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا، بیمار پڑا تو مر نہ سکا

۱۹۵۵ء کے ایک مکتوب میں صحت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اس طویل عرصے میں طبیعت کے اتار چڑھاؤ کا وہی رنگ ہے جو اس عمر کے مریضوں کا ہونا چاہیئے، جگر گردہ، معدہ، قلب سب ہی ماؤف ہیں، علاج کا سلسلہ جاری ہے قلبی حرج کی وجہ سے حرکت کی ڈاکٹر اجازت نہیں دیتے۔ نوشت و خواند پر سخت قدغن ہے"۔

تاہم اس آخری دور میں تین جلدوں میں ضخیم و جسیم "سوانح قاسمی" ترتیب دی مولانا قاری محمد طیب صاحب لکھتے ہیں۔

"میں نے سوانح قاسمی لکھنے کی فرمائش کی تو بہت خوشی اور امنگ سے اسے قبول کرتے ہوئے لکھا کہ میری علمی زندگی کی ابتدا "القاسم" ہی سے ہوئی تھی اور شاید انتہا بھی "القاسم" (یعنی مولانا نانوتویؒ) پر ہوگی، چنانچہ یہی ہوا کہ سوانح قاسمی کی چوتھی جلد آپ نے

شروع کی۔ پانچ صفحے لکھنے پائے تھے کہ عمرِ فانی نے جواب دے دیا اور "القاسم" پر انتہا ہوگئی۔"

۵ رجون ۱۹۵۶ء کو دن کے معمولات انجام دیکر خوابِ استراحت کے لیے لیٹے اور خواب ہی میں اپنے اللہ سے جاملے۔ پاس ہی چارپائی پر لیٹے ہوئے بھائی کو بھی پتہ نہ چلا کہ چہیتا بھائی ایک طویل سفر طے کر کے اپنے اللہ سے جاملا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

تصنیف و تالیف مولانا نے لکھنے کا آغاز "القاسم" سے کیا اور آخر "سوانح قاسمی" کی چوتھی جلد لکھتے لکھتے اپنے مولا سے جاملے۔ ملک کا کوئی قابلِ ذکر مجلہ ایسا نہ تھا جس کے صفحات انکی قلمکاریوں سے رنگین نہ ہوں۔ بیسیوں کتابوں پر مقدمے لکھے، ہر اہم مذاکرے میں شرکت کی اور اپنے تبحرِ علم سے لوہا منوالیا۔ محدّثوں کی محفل ہو یا فقہا کی مجلسِ افتاء، مؤرخوں کی انجمن ہو یا شاعروں کی سوسائٹی، ہر جگہ ان کی شخصیت جانِ محفل تھی۔

مولانا نے زندگی میں ہزاروں صفحات لکھے۔ درجن بھر اہم کتابیں ان سے یادگار ہیں، مگر ایک دو کتابوں کے علاوہ کوئی کتاب باضابطہ طور پر نہ لکھی۔ کسی طرف سے تحریک ہوئی اور پھر

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے انبار
خبر کرد میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

وہ صفحات پر صفحات لکھتے چلے جاتے تھے اور کبھی نظرِ ثانی نہ کرتے۔ یہ فریضہ ان کے مخلص احباب، عزیز شاگرد یا ناشر اپنے طور پر کرا دیتے تھے۔ "النبی الخاتم" اور "الدین القیم" ان کے عزیز شاگرد ڈاکٹر غلام دستگیر رشید (پروفیسر فارسی نظام کالج حیدر آباد) نے ترتیب دیں۔ "تدوین حدیث" "تفسیر سورۂ کہف" اور "مقالاتِ احسانی" کی ترتیب و تدوین اور ذیلی سرخیاں مولوی غلام محمد حیدر آبادی (حال کراچی) کی محنت کا نتیجہ ہے۔

مولانا سے کسی رسالے کے مدیر یا دوست نے فرمائش کی۔ موضوع سامنے آیا تو پھر خیالات کا سیلاب نوکِ قلم پر آگیا اور اسے صفحۂ قرطاس پر قلمبند کرتے چلے گئے۔ "النبی الخاتم" اور "مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت" اسی طرح وجود میں آئیں بعض اوقات لیکچر کی تیاری یا کسی طالب علم کی راہنمائی کے لیے نوٹس (NOTES) لیے اور یہ نوٹس (NOTES) ضخیم کتاب بن گئے۔ "الدین القیم"، "اسلامی معاشیات"، "تدوین حدیث" اور "تدوین قرآن" اسی قبیل کی تالیفات ہیں۔

مولانا کی پہلی کتاب "ابوذر غفاریؓ" دیکھ کر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ اس کتاب کا مؤلف آئندہ چل کر عظیم محقق ثابت ہوگا، چنانچہ مولانا تھانویؒ کی پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

طرزِ تحریر مولانا کی طرزِ تحریر بعض پہلوؤں سے انوکھی ہے۔

ان کی تحریر میں تصنیفی ترتیب نہیں پائی جاتی۔ اکثر موضوع سے ہٹ جاتے ہیں اور کتاب کے درجنوں صفحات ضمنی بحثوں میں کھپ جاتے ہیں۔ ایک بات سے دوسری بات نکال لیتے ہیں اور اس پر خامہ فرسائی کرتے کرتے موضوع سے بہت دُور نکل جاتے ہیں اور قاری سلسلۂ مضامین بھول ہی جاتا ہے۔ سید سلیمان ندویؒ کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"ایک بار جھونک میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو لکھتا چلا جاتا ہوں پھر اس کی نظرِ ثانی، حک و اصلاح میرے لیے مشکل ہو جاتی ہے۔ میں چھاپنے والے پر چھوڑ دیتا ہوں کہ خرافات کو حذف کر کے کارآمد اجزاء کا انتخاب کر لیں۔"

"خرافات" کہنا تو مولانا کی کسرِ نفسی ہے۔ تاہم ان کی ضمنی باتیں جو بذاتِ خود نہایت اہم اور خیال انگیز ہوتی ہیں۔ قاری کے لیے بھول بھلیاں بن جاتی ہیں۔ موضوع سے تعلق قائم نہیں رہتا۔ ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں۔

"ان کی تصانیف کو اسلوبِ نگارش اور ربطِ تحریر کے لحاظ سے نہیں بلکہ نقطۂ نظر کے لحاظ سے دیکھنا چاہیئے کہ ان میں علوم و حقائق اور استنباط و استخراجِ مسائل کا کسقدر گراں بہا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔"

بے ربطی کے باوجود مولانا کی بے ساختگی اور برجستگی قاری کو اکتانے نہیں دیتی۔ ان کا "البیلا پن" قابلِ غور ہے۔ جملوں کی نشست و برخاست، تراش خراش اور گرامر کے وہ پابند نہیں۔ جو الفاظ قلم سے ٹپک گئے وہ کاٹ کر دوسرے نہیں لکھے۔ بعض اوقات ایک جملہ پورا نہیں ہو پاتا کہ درمیان میں جملہ معترضہ شروع ہو جاتا ہے اور جملے کا باقی حصہ اس میں کہیں دم توڑ دیتا ہے۔ مولانا کی تحریریں اُن کے اسلوب کے واقف کاروں کے لیے چنداں "وحشت خیز" نہیں مگر نئے قارئین کے لیے یہ تحریریں زیادہ جاذبِ توجہ نہیں بن سکتیں۔

یوں تو مولانا کی ہر تحریر اپنے اندر جاذبیت رکھتی ہے تاہم ان کی مندرجہ ذیل تالیفات بہت مقبول ہیں۔

۱۔ ابو ذر غفاریؓ ۲۔ الدین القیم ۳۔ النبی الخاتم ۴۔ تدوینِ قرآن ۵۔ تدوینِ حدیث
۶۔ اسلامی معاشیات ۷۔ ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی ۸۔ مقالاتِ احسانی ۹۔ تفسیر سورۂ کہف
۱۰۔ سوانح قاسمی (سہ جلد) ۱۱۔ تذکرہ شاہ ولی اللہ ۱۲۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

الفرقان (لکھنؤ) کے "مجدد الف ثانی نمبر" اور شاہ ولی اللہ نمبر" میں ان کے مقالات "جان اشاعت" تھے۔ ان مقالات سے جہاں ان کے ذوقِ تاریخ، اندازِ فکر اور ژرف نگاہی نمایاں ہے۔ ان کے سینے میں اٹھتے ہوتے طوفان اور مچلتے ہوئے

ارمان بھی ظاہر ہیں۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کی شاعری

مولانا مناظر احسن گیلانی کے گھر میں شعر و سخن کے چرچے تھے۔ ان کے پہلے استاد اور حقیقی چچا مولانا ابو نصر شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے تھے۔ بچپن کے اس ماحول سے متاثر ہونا فطری ہے اور زندگی کا ایک طویل حصّہ تقریباً تیس سال عروس البلاد حیدر آباد دکن میں گزرے جہاں شاعروں کی محفلیں جمتیں اور علم و ادب کی داستانیں چھڑی جاتی تھیں۔ مولانا کی خداداد صلاحیتوں نے سخن پرور مجلسوں سے فیض اٹھایا۔ وہ سخن فہم اور سخن شناس ہی نہ تھے بلکہ سخن سرائی سے بھی پایا۔

مولانا نہایت حساس تھے اور ہر دلِ حساس فطرتاً شاعر ہوتا ہے۔ مولانا کے ماحول اور طبعی صلاحیتوں نے انہیں شعر کہنے پر مجبور کر دیا۔ عربی، فارسی، اردو اور ہندی کے قدیم شعری سرمائے پر انکی براہ راست نظر تھی۔ انہیں بیسیوں اشعار یاد تھے اور مشرقی زبانوں کے شعراء کے کلام کا موازنہ نہایت استادانہ مہارت سے کرتے تھے۔ مولانا نے فارسی، ہندی اور اردو میں اشعار کہے ہیں، ہماری ہندی نما اردو میں ان کی نعتیں وجد انگیز اور کیف پرور ہیں۔ ان نعتوں میں انہوں نے "دھرمی" کا تخلص ستعمال کیا ہے۔ یہ نعتیں مولانا کے جذبات کی عکاس ہیں ان کا ایک شعر ہے۔ ؎

تجھ سے توڑوں تو کس سے جوڑوں تیری گلی کی خاک بٹوروں

"النبی الخاتم" لکھنے والا قلم کس "البیلے پن" میں دل کی پُرسوز دنیا کے نذرانے پیش کرتا ہے۔ ان کے حسّاس اور دردمند دل کی آہیں محبوب دوستوں کے مرثیے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی وفات پر مرثیہ لکھا چار شعر یہ ہیں۔

گرچہ تو تنہا گیا ہے پر دلاتا ہوں یقین آگے پیچھے آرہے ہیں سب تیرے احباب و یار
اپنی تحریروں میں خود میری نظر تجھ پر رہی راستے کا تیری رہا دل کو ہمیشہ انتظار
راہ میں آئے لکھنؤ اور دریا باد بھی ہیں جہاں تھامے کلیجے تیرے کچھ یارانِ غار
اور ہو دسنہ جو آتا تو رہے اس کا خیال ایک گیلانی میں بھی ہے آرزوؤں کا مزار

مولانا اپنی نعتیں عموماً ترنم میں سناتے تھے اور بقول علی میاں اہلِ مجلس کو کیف و سرور کا وہ بادۂ دوشینہ پلاتے کہ مدینہ طیبہ کی فضائیں آنکھوں میں لہرا جاتی تھیں۔

اخلاق و عادات

مولانا نہایت ہنس مکھ تھے اور معمولی معمولی الفاظ و فقرات سے ایسے چٹکی لیتے تھے کہ حاضرین ہی نہیں بلکہ جس کی چٹکی لی جاتی وہ خود بھی مسکراتے بغیر نہ رہ سکتا تھا قیامِ حیدر آباد میں ان کی قریبی مسجد کے مؤذن ایک دلچسپ بزرگ تھے۔ مولانا انہیں "مولوی مفرّح القلوب" کہا کرتے تھے۔

مولانا دینی معاملات میں کسی تعلق یا رشتہ کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ کلمۂ حق کہنے سے انہیں کوئی دنیوی تعلق نہیں روک سکتا تھا۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے مضامین کی ترتیب اور مواد کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ قدیم مدرسہ کے فارغ التحصیل ہونے کے بجائے عصر حاضر کے سکالر دکھائی دیتے ہیں۔ جس کی عمرانیات واجتماعیات پر گہری نظر ہے بالخصوص شاہ ولی اللہ کے بارے میں مضمون میں مولانا نے جدید ذہن کی رعایت اور دینی حقائق کی تفہیم میں جو طریقہ اختیار کیا وہ "ادع الی سبیل ربك بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ" کے ذیل میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طرزِ استدلال اور اندازِ بیان کو دیکھ کر مولانا سلیمان ندویؒ نے کہا کہ "وہ دیوبندی العلم مگر ندوی الفکر تھے۔"

کتاب دوستی مولانا کی تحریروں سے ان کی وسعت مطالعہ عیاں ہے۔ نادر ونفیس کتابیں خریدتے تھے اور ان کا عمیق مطالعہ کرتے تھے۔ مولانا علی میاں مئی ۵۶ء میں مشرقِ وسطیٰ کے دورے پر شام گئے تو انہیں ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"واقعی آپ کا وجود مسعود اس وقت کم از کم میرے لیے سراسر رشک و غبطہ بنا ہوا ہے خیال شام کے ان مناظر کا ایک طرف ستاتا ہے جن کی تفصیل کردعلی صاحب کے خطوط الشام میں پڑھ چکا ہوں اور دھیان ان اسلامی تعمیرات کی طرف منتقل ہوتا ہے جنہیں عمر بن عبدالعزیز جیسے بزرگوں نے اس لیے باقی رکھا کہ وہ غیظا القلوب الکفار نظر آتے ہیں۔ سب سے زیادہ تڑپ دِل میں ان کتابوں کی پیدا ہو رہی ہے جس سے شام کے کتب خانے پٹے پڑے ہونگے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وابن قیمؒ، علامہ ذہبی السبکی والہٗ کے وطن میں جو کچھ مل رہا ہو اسے ملنا ہی چاہیئے۔ "یوم المحاضرہ" کے بعد تو ہفتہ پھر آپ کا ان ہی چیزوں کی سیر و تماشے میں بسر ہوتا ہوگا۔ معلوم نہیں کہ دول الاسلام ذہبی کا مکمل نسخہ اور قراۃ الزمان ابن الجوزی السبط کی طباعت کا انتظام کیا گیا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ مرنے سے پہلے کم از کم دونوں کتابوں کے مطالعہ کا موقع مل جاتا۔ ابن عساکر کی تاریخ دمشق خدا جانے مکمل ہو کر بازار میں آگئی یا نہیں۔ میرے پاس صرف ابن بدران کی تلخیص کی ساتویں جلد تک ہے۔"

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے وسعتِ نظر کے ساتھ ساتھ اخذ کی بے پناہ قوت سے نوازا تھا۔ قرآنِ کریم کی جن آیات سے سینکڑوں مرتبہ ہم گزرتے ہیں اور ان الفاظ کے وہی معنی ومفہوم ہم جانتے ہیں جو مولانا گیلانی پیش کرتے ہیں مگر مولانا

باقی صـ ۵۷ پر

مغتنماتِ دھر

محترم فقیر محمد صاحب

مولانا شیر زمان مدظلہٗ

ربیع الثانی کے شمارے میں ہم نے یہ گذارش کی تھی کہ کسی صاحب کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کے ایسے تلامیذ کا علم ہو جو ابھی بقیدِ حیات ہوں تو ان کے حالات انوارِ مدینہ کے لیے قلمبند فرما کر ارسال فرمادیں — محترم فقیر محمد صاحب نے ہماری اس گذارش پر حضرت مولانا شیر زمان صاحب مدظلہٗ کے حالات تحریر فرما کر ارسال فرمائے ہیں جو حاضرِ خدمت ہیں۔

حضرت مولانا شیر زمان صاحب ولد جناب لطیف اللہ خان صاحب ساکن بفہ ضلع ہزارہ بھی ان خوش نصیب حضرات سے ہیں جنہوں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے دورہ پڑھا ہے۔

صاحبِ موصوف حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ بفوی ہزاروی مدفون فی دیوبند کے داماد ہیں اور حضرت مرحوم ہی کی ترغیب پر دیوبند تشریف لے گئے۔ وہاں سات سال سے کچھ زیادہ قیام رہا۔

درسیات کے اساتذہ حضرت مولانا غلام رسول صاحب مرحوم۔ مولانا سہول صاحب۔ مولانا گل محمد خانصاحب مولانا مرتضےٰ حسن صاحب اور مولانا محمد حسن صاحب برادرِ حضرت شیخ الہند وغیرہم ہیں۔ دورہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا۔ کاغذی سند مدرسہ عالیہ گورنمنٹ سلہٹ میں دفتر سے کسی مرزائی نے خورد برد کر دی۔ فراغت کے بعد کلکتہ مدرسہ رمضانیہ میں پانچ سال مدرس رہے، پھر مدرسہ عالیہ گورنمنٹ سلہٹ میں (اسلامیہ کالج) ترمذی شریف نسائی شریف، ابو داؤد شریف وغیرہا کتب تقریباً بیس سال تک پڑھاتے رہے، بلکہ آخری زمانہ میں آٹھ نو ماہ مہتمم بھی رہے۔ مدتِ ملازمت پورا کرنے سے پہلے ہی ۱۹۴۷ء میں واپس بفہ تشریف لائے۔ دارالعلوم دینی کی بنیاد رکھی۔ مدرسہ تجوید القرآن چل رہا ہے۔ دمہ کی بیماری کا دورہ آتا ہے تو سخت تکلیف ہوتی ہے، ورنہ عام صحت بہت اچھی ہے۔ مجھ جیسے کورہ بلکہ علمائے کرام کی پیچیدہ مسائل میں رہنمائی فرماتے رہتے ہیں۔ عمر مبارک تقریباً اسّی ۸۰ سال ہے۔

حضرت موصوف مولانا اعزاز علی صاحب سے متاخر اور مولانا عزیر گل صاحب کے ہم درس رہے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہیں۔ ۱۳۵۹ھ میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مبارک ہاتھوں ان کو ایک تحریر دی ہے۔ جس کے درمیانی چند جملے لکھ رہا ہوں اسی سے صاحب موصوف کا علمی تبحر معلوم ہو جائیگا۔

الحمد لمن ـ اما بعد فقد انعم اللہ علی اخینا　　شیر زمان بالحرص علی العلوم العربیۃ و شدۃ طلبها ـــ فضرب اکباد الابل الی منبع العلوم و مرکزها اعنی دار العلوم الدیوبندیۃ وشعبها ...... فاقام فیها دهرا طویلا یفوق عن سبع سنین ...... وحیث انہ رزق من اللہ تعالٰی ذهنا ثاقبا　　فلم یزل فی کل امتحان یفوق علی اقرانہ ..... ولما القی خطبتہ الرائقۃ البدیعۃ فی الحفلۃ العظیمۃ سنۃ الف و ثلثمائۃ وثمان وعشرین من الهجرۃ فی جمع یفوق علی خمسین الفا من بین العلماء الکرام والطلبۃ العظام وخواص المسلمین و العوام ارتفعت الانظار الی حداثۃ سنہ ثم رفعۃ شانہ واقرت الالسنۃ بعلو کعبہ فی حسن الخطابۃ وفصاحۃ لسانہ فالعم علیہ بجبۃ ثمنیۃ ونعم عدیدۃ --

کتبہ ببنانہ المعتصم بحبل الرؤوف الصمد العبد المدعو بین الانام بحسین احمد غفرلہ ولوالدیہ ومشائخہ الودود الاحد ـ خادم العلوم بدار العلوم الدیوبندیۃ فی رمضان سنہ ۱۳۵۹ من الهجرۃ النبویۃ علیہ و علی الہ وصحبہ الف الف صلوۃ وتحیۃ ـ

بقیہ : مولانا مناظر احسنؒ

انہی معانی سے ایسی بات نکالتے ہیں جو کبھی ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آئی ہوتی اور یہ بات دل لگتی ہوتی ہے۔ انکی دقیقہ سنجی کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کئی انجمنوں اور علمی مجالس کی اعزازی رکنیت بھی رکھتے تھے۔ ندوۃ المصنفین دہلی کے رکن تھے۔ ۱۳۵۰ھ سے ۱۳۶۷ھ تک دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ میں شامل رہے۔ اسی طرح ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ کے اعزازی مدیر کی حیثیت سے ایک سال کام کیا۔ --

اس سے ہوشیار رہیے

ایک شخص نے جس کا نام محمد شاہ اور رنگ گورا ہے ہمارے مدرسہ "مدرسہ عربیہ اشرف العلوم" کی رسید بُک چرا لے گئے ہیں۔ اگر یہ شخص ہمارے مدرسہ کے نام سے چندہ کر رہا ہو تو اسے چندہ ہرگز نہ دیا جائے اور ہمیں مطلع فرما کر ممنون فرمایا جائے۔

منتظم مدرسہ عربیہ اشرف العلوم، جلو والی ضلع ڈیرہ غازیخان

اِطلاع

کتب خانہ "حافظ خیر محمد و نور محمد" ۱۴۔ بی شاہ عالم مارکیٹ سے بالمقابل استقلال فونڈری نمبر ۳۰ سلطان پورہ روڈ لاہور منتقل ہو گیا ہے۔ احباب مطلع رہیں

عہد عالمگیری کی ایک نادر تالیف

مؤلفہ : عبداللہ خویشگی قصوری

ترجمہ و تلخیص
حضرت سید
نفیس مدظلہ

اخبار الاولیاء

افغان بزرگوں کا ایک قدیم تذکرہ جو تا حال طبع نہیں ہوا

سلسلہ کے لیے
ملاحظہ ہو -
جلد: ۲ - شمارہ: ۹

—— باب سوم ——

(دربیان احوال نساء عارفات خویشگیاں و سائر افغانان)

(۱) بی بی مہکلی : رابعہ عصر و زبیدۂ دہر، عزیر زئی قبیلے سے تھیں، میاں اخوند سعید ان کی خدمت میں بہت جاتے تھے۔

(۲) بی بی درہ : عارفۂ وقت و کاملۂ زمان، حسین زئی قبیلے سے تھیں۔ ان کے خاوند سعید خاں موسے زئی تھے۔

(۳) بی بی شیخی درخانی : عارفۂ روزگار، حسین زئی قبیلے سے تھیں، بدہ زئی قبیلے میں بیاہی گئیں۔

(۴) بی بی ممی : خواہر شیخ یوسف بنگزئی، عابدہ و زاہدہ۔

(۵) بی بی شیخی فاطمہ : حسین زئی۔ قائم اللیل و صائم الدہر۔

(۶) بی بی لسو : حسین زئی۔ صالحۂ وقت۔

(۷) بی بی : حسین زئی، صالحہ و عارفۂ زمانہ۔

(۸) بی بی دویہ : المشتہر لعلائی، دختر شیخ سلیمان دانا و خواہر شیخ ملی قتال۔ اہلیۂ مہمند بن دولتیار۔

(۹) بی بی راستی : از اسباطِ خواجہ یحیٰی کبیر۔ زوجۂ خواجہ اویس شروانی۔

(۱۰) بی بی شیخزادی : از نسل خواجہ یحیٰی کبیر۔ زوجۂ میاں ترمان، عارفۂ کاملہ و مکملہ۔

(۱۱) بی بی صورت : دختر میاں لبستان کاکر۔

باب چہارم دربیان انساب افغاناں و سبب آمدن ایشان از بیت المقدس بکوہستان و از انجا بہندوستان

باب پنجم در احوال مشائخ قصور و نواحیٔ آں از ورائی افغانان

(۱) شیخ کمال چشتی : ازمشائخ متقدمین۔ بنائی قلعہ قصور سے پیشتر زمانہ میں تھے۔ قلعہ راجہ رائے سکھ کے عہد میں تعمیر ہوا۔

(۲) پیر ادھیا غازی : چوہاناں قصور ان کی اولاد میں ہیں۔ پیر ادھیا غازی شیر شاہ سوری کے عہد میں مشرف باسلام ہوئے۔ فوج میں صد پنجاہی عہدہ پر تھے۔ لکھی جنگل میں تعینات تھے مفسدانِ لکھی جنگل کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کیا۔

(۳) شیخ بھاگو ڈوگر : اصل نام بہاء الدین، سہروردی سلسلہ میں منسلک تھے۔ قریہ شیخ بھاگو ان کا آباد کیا ہوا ہے۔ وہیں مزار ہے۔

(۴) میاں کیکا گوجر : عارف باللہ۔ مرید شیخ بھاگو۔ شیخ بھاگو کے مزار کے پائیں میں دفن ہیں۔

(۵) مخدوم علی بافندہ : ازمقتدایان روزگار، مدفن بالہ کہ قصور سے جانبِ مغرب ایک فرسنگ فاصلے پر ایک گاؤں ہے۔ حاشیہ میں لکھا ہے کہ مخدوم علی دراصل قریشی تھے۔ کسب بافندگی کی بنا پر بافند کہلائے، لیکن کتب معتبرہ میں ہے کہ وہ قریشی تھے۔

(۶) شیخ حبیب آہنگر : معاصر میاں اخوند سعید، موطن و مدفن قریۂ شیخ عماد۔

(۷) شاہ ابوحنیفہ قریشی : از اولاد حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانی۔ آپ کے ایک بزرگ شیخ عماد ملتان سے آئے۔ ان کے نام سے "شیخ عماد" گاؤں آباد ہوگیا۔ شاہ ابوحنیفہ عالم ربانی تھے۔ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ قبر بالہ میں ہے۔

(۸) شاہ حسین قریشی : برادرِ خوردِ شیخ ابوحنیفہ قریشی۔ صاحبِ کشف و کرامات۔ قصور بہت آتے تھے۔ مولد قریہ شیخ عماد، مدفن لاہور۔

(۹) شیخ جلال ہندوستانی : معاصر میاں اخوند سعید۔ مدفن قریۂ روہیوال۔ بعض کہتے ہیں قصور میں مدفون ہیں۔

(۱۰) درویش محمدؒ : مجذوب، از اولاد شاہ نور، ساکن کھائی۔ وہاں سے آکر نظام پور میں سکونت اختیار کی۔ یہ گاؤں قصور سے ایک فرسخ کے فاصلے پر جانب مغرب واقع ہے۔ قطب الدین خان کے زمانہ میں تھے۔ مدفن نظام پور۔

(۱۱) شاہ بہاء الدینؒ : جدِ شاہ مقیم، صاحبِ حال و کمال۔ مدفن "حجرہ شاہ مقیم"۔

(۱۲) شیخ داؤد نجار شیر گڑھی : ازمشائخ روزگار۔ مخدوم الملک سلطان پوری نے ان سے ملاقات کی اور خوش وقت ہوئے۔ مدفن شیر گڑھ جو قصور سے جانبِ مغرب تیس کوس کے فاصلے پر ہے۔

(۱۳) شاہ مقیم : ولیٔ کامل۔ ازاولاد شاہ بہاء الدین۔ حاجی نعمت اللہ کی خدمت میں بھی سلوکِ باطنی حاصل کیا۔

(۱۴) شاہ نور : جدِّ درویش محمد مجذوب۔ قریۂ کھائی نزد فیروز پور میں سکونت پذیر تھے۔

(۱۵) شیخ ابو محمد فتحی : چشتی مشرب۔ عابد و زاہد۔ فیروز پور کے قریب چبرہ گاؤں میں مدفون ہیں۔

(۱۶) شیخ الہداد سرہندی : سلسلۂ چشتیہ و سہروردیہ میں منسلک تھے۔

(۱۷) شیخ حاجی رتن : ازمشائخ متقدمین۔ مدفن بھٹنڈہ۔

(۱۸) شیخ میر لاہوری : صاحب تجرید و تفرید۔ ان کے اکثر خلفاء اہلِ علم تھے۔ دارا شکوہ ان کا بہت معتقد تھا۔ لاہور کے جنوب میں مزار ہے۔

(۱۹) شیخ بلاول : حضرت شیخ میر لاہوری کے ہم عصر تھے۔

(۲۰) شیخ عمر : عالم علوم ظاہری و باطنی۔ لاہور کے جنوب میں ان کا مزار ہے۔

(۲۱) شاہ حسین ڈھدہ : بافندگان سے تھے۔ سہروردی مشرب۔ مزار باغ فیض بخش لاہور کے مشرق میں واقع ہے۔

(۲۲) حسّو تیلی : مجذوب، مدفن لاہور

(۲۳) شیخ حاجی مغل : چشتی مشرب۔ لاہور میں باغ حاجی اللہ بخش دھوبی کے جنوب میں مدفون ہیں۔

(۲۴) شیخ موسیٰ آہنگر : ازمشائخ لاہور۔ معاصر شیخ داؤد شیر گڑھی۔

(۲۵) شیخ ابو اسحاق مزنگ : ازبزرگانِ روزگار۔ فرقۂ مزنگانِ لاہور ــــ رافضی شعار تھا۔ اس گمراہ جماعت نے حضرت شیخ ابو اسحاق کی برکت سے ہدایت پائی اور طریقہ اہلِ سنت و جماعت اختیار کیا مزار محلہ مزنگاں میں ہے۔

(۲۶) شاہ گدا : مجذوب، لاہور میں محلہ شاہ گدا ان کے نام پر ہے۔ حضرت شیخ اسحاق کہ لاہور کے استاذ الاساتذہ تھے، ان کے بہت معتقد تھے۔

(۲۷) شاہ سفر : مجذوب، لاہور میں دریائے راوی کے کنارے مزار ہے۔

(۲۸) شیخ طاہر : مرید شیخ احمد کابلی (حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ) کمال تقویٰ و فضیلت

(بقیہ ص ۶۴ پر)

جناب حکیم محمد سعید دہلوی

صحت وصفائی

اسلام عرب میں نمودار ہوا تھا۔ اِس خطۂ زمین کے متعلق سب جانتے ہیں کہ اس کرۂ ارض میں اس خطّہ کا کیا مقام تھا اور اسکی کیا حیثیت تھی، لیکن اس ریگزارِ عرب سے، جہاں زندگی کی کوئی سہولت میسّر نہ تھی اور جہاں آسودگی کی کوئی شے حاصل نہ تھی، چشمۂ اسلام پھُوٹا، جاری ہوا اور اسطرح جاری ہوا کہ سارا کرۂ ارض اس سے فیضیاب اور شاداب ہوا۔ اس تاریخی حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اس کرۂ ارض کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے کہ جہاں اسلام کے چشمۂ فیض سے اقوام عالم مستفیض نہ ہوئی ہوں۔ یہ ناقابلِ انکار حقائق ہیں اور ناقابلِ تردید واقعات ہیں کہ دنیا کے ہر ملک کو اسلام نے حکمرانی کے لیے سماجیات میں فہم کے لیے، اخلاقیات میں اتباع کے لیے، معاشیات میں زندگی سنوارنے کے لیے، غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی میں کچھ نہ کچھ ضرور بخشا ہے۔

کسی مذہب کی رفعت وعظمت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ ساری کی ساری اقوامِ ارض اس کی کسی نہ کسی صورت میں خوشہ چین ہوں۔ لاریب یہ فخر صرف اسلام ہی کو حاصل اور یہ مقامِ بلند وارفع صرف مسلمانوں ہی کو نصیب ہے کہ وہ اس صورتِ حال پر سرافتخار بلند کریں اور اُن حقائق کو ہرگز نظر انداز نہ کریں کہ جو اس عظمت اور رفعت کا ذریعہ ہیں۔

میں جب غور کرتا ہوں تو اسلام کی اس رفعت وبلندی کے اسباب بہت زیادہ ہیں۔ میں اُن پر آج بحث نہیں کرسکتا، لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان تمام اسباب میں کہ جو عظمتِ اسلام کے لیے گنائے جاسکتے ہیں ایک اہم سبب اسلام میں طہارت اور پاکیزگی کا بے مثل معیار ہے۔ اسلام نے صفائی اور پاکیزگی کو جو اہمیت دی ہے وہ اُن نہایت مضبوط ستونوں اور اصولوں میں سے ایک مضبوط ترستون اور اصول ہے جس پر نظامِ اسلام قائم ہے، بلکہ نظامِ عالم برقرار ہے۔ قرآنِ کریم اور حدیثِ نبوی نے جو راہ نما اصولِ زندگی عطا کیے ہیں ان کی سب سے بڑی خصوصیت اور سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ ہرگز ایسے نہیں ہیں کہ محض کسی خطہ ارض کے لیے قابلِ عمل ہوں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی اصول اس قدر سادہ اور اس قدر مضبوط ہیں کہ کرۂ ارض کے ہر ملک وملت کے لیے قابلِ عمل ہیں اسلام عالمگیر مذہب ہے اور وہ بلاتخصیص ملک وملت اور بلاتخصیص آب وہوا، رنگ ونسل، ہر انسان کے لیے اصول وہدایت

رکھتا ہے۔ ایسا مذہب صرف وہی ہو سکتا ہے کہ جس کی تعلیمات پر نوع انسانی کا ہر طبقہ اپنے خاص ماحول میں بہ سہولت اور بلا دقت عمل پیرا ہو سکے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کے ہر ملک و ملت تک اسلامی اثرات و اصول ہرگز نہ پہنچتے۔ تاریخ کے صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے دنیا کا حال کیا تھا۔ جہاں تک حفظِ صحت اور طہارت کا تعلق ہے۔ دنیا کا حال یہ تھا کہ غسل کرنا معیوب تھا، ناخن ترشوانا غلط تھا، صفائی اور طہارت کے دوسرے لوازم بے حقیقت تھے۔ قرآن نے سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ صفائی اور طہارت پر زور دیا اور یہ درس دیا۔ لا یمسہ الا المطہرون یعنی قرآنِ کریم کو وہی ہاتھ لگا سکتے ہیں کہ جو طاہر ہوں، پاک، صاف ہوں۔ پھر ایسا اور حکم ارشاد ہوا ہے کہ خدا ان لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو طاہر ہوں، پاک ہوں۔

تعلیماتِ اسلام کے بارے میں ایک بنیادی بات ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہیئے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "تمہارے لیے اللہ کا رسول بہترین نمونہ ہیں"۔ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فعل اور ہر عمل قرآنی تعلیم کے مطابق تھا۔ قرآن کریم جب دستورِ حیات بن کر نازل ہوا تو اس پر عمل پیرا ہونے اور عمل کرانے والے جناب رسالتمآب ہی تھے۔ اگر قرآن پر عمل نہ ہوتا تو یہ فقط ایک کتابِ قانون ہی رہتا۔ قرآن پر جس احتیاط و تسلسل اور صحت کے ساتھ عمل ہوا، جنابِ رسول کا عمل، خلفائے راشدین کا عمل اور دوسرے بزرگانِ دین کا عمل، اس کی مثال ملنی ممکن نہیں ہے۔

جناب رسول اللہ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اور پاکیزہ چیز پسند فرماتا ہے"۔ ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا: تنظفوا فان الاسلام نظیف۔ یعنی "صاف ستھرے رہا کرو کہ اسلام پاکیزہ مذہب ہے"۔ پھر ارشاد ہوا: ان اللہ یبغض الوسخ والشعث۔ یعنی اللہ تعالیٰ میل کچیل اور بکھرے بال پسند نہیں فرماتا۔

بالکل ابتدائی زمانۂ اسلام میں نبی اکرم کو اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی تھی: وثیابک فطہر والرجز فاھجر "یعنی اپنے لباس کو صاف ستھرا رکھا کرو اور ہر قسم کی گندگی سے پرہیز کیا کرو"۔ یہ ارشاد باری تعالیٰ پُر از معانی ہے گندگی اور غلاظت سے ہر قسم کی گندگی مراد ہے، خواہ وہ جسم کی ہو خواہ وہ روح کی ہو، خواہ وہ ماحول کی ہو۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ ہدایات اس دور میں جاری ہوئیں کہ جب سارا عرب بنجر اور بے آب و گیاہ تھا پانی کی قلت تھی، کوئی سہولت میسر نہ تھی۔ ایسے شدید حالات میں اگر پاکیزگی اور طہارت کی ہدایات نظر انداز ہو جائیں تو کوئی تعجب نہ ہوتا، لیکن اسلام نے ایسا نہیں کیا۔ پانی کی شدید کمیابی کے باوصف اس نے غسل پر زور دیا ہے۔ دن میں پانچ بار وضو کو لازمی قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں صفائی اور طہارت کو کس درجہ

اہمیت حاصل ہے۔ اسلام کی ایک یگانہ خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر نیک اور اچھا کام عبادت ہے۔ راستے کو جھاڑ جھنکار سے صاف کر دینا، ناپاکی اور نجاست کو صاف کر دینا۔ غلاظت اور کوڑے کرکٹ سے نہ صرف خود دامن بچانا بلکہ دوسروں کے لیے بھی یہی چاہنا اور اس سلسلے میں امکانی خدمت کرنا، یہ سب نیک اور اچھے کام ہیں۔ لہٰذا بلاشبہ یہ عبادت کے ذیل میں آتے ہیں۔ اسلام ہر نیک اور اچھے کام کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ اسی میں صفائی، پاکی اور طہارت بھی شامل ہے۔

مسلمان قوم کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اس قوم کے مذہب نے جن باتوں کی تلقین کی انہیں اس نے نظام زندگی کا غیر منفک حصہ بنا لیا۔ اگر آپ نے دنیا کی سیاحت کی ہے اور دوسرے ممالک اور اسلامی ممالک کے طرزِ زندگی کو تقابلی نقطۂ نظر سے دیکھا اور پرکھا ہے تو ضرور آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ مسلمان کتنے ہی پسماندہ ہوں، دولت و اثرات کے اعتبار سے بے مایہ ہوں، غربت و فلاکت کے شکار ہوں، مگر جو چیزیں ان کے مزاج میں اسلامی تعلیم و تلقین کے باعث رچ بس گئی ہیں۔ دوسرے لوگ وسائل و ذرائع کی فراوانی کے باوجود ابھی ان تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔

اگر آپ نے کلاسکی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے اور مختلف قوموں اور ملتوں کے کلاسیکی ادب پر آپ کی نظر ہے تو بلاشبہ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ مسلمانوں کی محفلیں اور مجلسیں، ان کے خلوت خانے اور جلوت کدے، ان کی حویلیاں اور غریب خانے، ان کے محلات و قصور اور کلبۂ احزان اپنی صفائی اور پاکیزگی کے اعتبار سے یکتا اور منفرد تھے اور اب بھی وہ کسی نہ کسی حد تک خصوصیت کو قائم رکھے ہوتے ہیں۔ صاف ستھرا فرش، عود و عنبر کی خوشبو، کیوڑے اور گلاب کا حاضرین محفل پر چھڑکاؤ، بہترین اور اعلیٰ قسم کے عطریات کا استعمال اور لباس و پوشاک میں ان کی مہک قائم رکھنے کا اہتمام آج بھی قائم و باقی ہے۔ غرض طہارت، صفائی اور پاکیزگی کو مسلمانوں نے کچھ اس طرح مختص کر لیا تھا کہ اس نے ایک امتیازی وصف کی صورت اختیار کر لی اور جس کا اتباع سارے عالم نے کیا۔

آج بھی جب کہ مسلمان اپنی بہت سی عادتوں اور خصوصیتوں کو فراموش کر چکے ہیں۔ جن چیزوں سے کچھ نہ کچھ لگاؤ ان کا قائم ہے۔ ان میں صفائی اور طہارت کی یہ عادت بھی ہے۔ البتہ ایک فرق ضرور نمایاں نظر آتا ہے وہ فرق یہ ہے کہ اس عادت کا اہتمام و انصرام ذاتی حیثیت سے تو بڑی حد تک موجود ہے، لیکن اجتماعی اعتبار سے یہ عادت کچھ کمزور سی پڑ جاتی ہے۔ صاف ستھرے لوگ جن محلوں میں رہتے ہیں اور جن آبادیوں میں اپنے شب و روز بسر کرتے ہیں وہ اتنے صاف ستھرے نظر نہیں آتے جتنے خود۔ یہ صورت تکلیف دہ بھی ہے اور ضرر رساں

بھی۔ صفائی اور صحت کا سب سے اچھا، دیرپا اور خوش گوار اثر انسان کی صحت پر پڑتا ہے، صحت و صفائی ہم معنیٰ ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا، لیکن اگر ماحول صاف سُتھرا نہیں ہے، آبادی اور بستی کی فضا طہارت اور پاکیزگی سے خالی ہے۔ محلے، گلیاں اور کوچے گرد سے اور گند سے اٹے ہوئے ہیں تو ذاتی صفائی اور طہارت سے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ اس سلسلے میں وہی مساعی کارگر ہو سکتی ہیں جو ذاتی اور اجتماعی ربط و اتصال رکھتی ہوں۔ دونوں میں سے ایک ہے اور ایک نہیں تو کوئی نتیجہ اور فائدہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ ایک آزاد، فعّال اور زندہ قوم کی حیثیت سے ہمیں اپنی اس عادت کو پھر اختیار کرنا ہے اور اُسی شان سے اختیار کرنا ہے جس نے ہمارے کردار اور سیرت میں پختگی پیدا کر دی تھی اور یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں صرف عزم و ارادے کی ضرورت ہے۔ اگر عزم راسخ ہے اور ارادہ پختہ ہے تو کوئی کام بھی دشوار نہیں۔ ◆◆

بقیہ : اخبار الاولیاء

کے حامل تھے۔ نذر و فتوح نہیں لیتے تھے۔ اپنی محنت سے روزی کماتے تھے۔ بازار سے معرّا کتاب خریدتے، تصحیح کر کے اس پر حاشیہ لکھتے اور پھر فروخت کرتے۔ اس طرح اہل و عیال کی گزران ہوتی۔ اہلِ دنیا کو مجلس میں جگہ نہ دیتے تھے۔

(۲۹) شاہ ابوالمعالی : مشائخِ وقت سے تھے۔ شیخ داؤد شیر گڑھی کی اولاد سے تھے۔ شیر گڑھ سے لاہور چلے آئے۔ نظم و نثر میں آپ کی بہت تصانیف ہیں۔ علم طب پر ایک کتاب "تجربات شاہی" آپ نے لکھی ہے۔

(۳۰) شیخ عبدالرشید چشتی جونپوری : مرشد عبداللہ خوشگی مؤلف اخبار الاولیاء۔

(۳۱) عبداللہ خوشگی مؤلف اخبار الاولیاء : بن عبدالحق المشتہر بہ عبدالقادر خوشگی بن شیخ احمد شوریانی قصوری۔ مولد قصور، علمائے لاہور میاں محمد صادق، میاں محمد سعید اور شیخ نعمت اللہ کی خدمت میں تحصیلِ علم کی۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ شیخ عبدالرشید جونپوری کے مرید تھے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے بزرگوں کی خدمت میں رہے اور فیضان حاصل کیا۔